ISSN 2348-3687
Issue: 44

اُردو زبان وادب کا تحقیقی رسالہ

اُردو ریسرچ جرنل

URDU RESEARCH JOURNAL

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۵
(October to December 2025)

مدیر: ڈاکٹر عزیر احمد
معاون مدیر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن

www.urdulinks.com/urj

قلم کاروں سے گزارش

'اردو ریسرچ جرنل ایک اعلیٰ تحقیقی جرنل ہے جس کا مقصد اردو میں تحقیق وتنقید کو فروغ دینا ہے۔ اس وجہ سے 'اردو ریسرچ جرنل' کے لئے نگارشات بھیجنے والے معزز قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھیں:

☆ مضمون نگار اپنا نام، عہدہ، مکمل پتہ، موبائل نمبر اور ای میل مضمون کے شروع یا آخر میں ضرور لکھیں۔

☆ غیر شائع شدہ مضامین ہی ارسال کریں۔

☆ ای میل بھیجتے وقت مضمون کے غیر مطبوعہ ہونے کی تصدیق کر دیں۔

☆ مضمون بھیجنے کے بعد کم از دو شماروں کا انتظار کریں۔

☆ کسی بھی قسم کی خط و کتاب ای میل پر ہی کریں۔ فون پر رابطہ کرنے سے گریز کریں۔

☆ مضمون کے ناقابل اشاعت کی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ اگر آپ کا مضمون لگاتار دو شماروں میں نہیں شائع ہوتا ہے تو آپ اس کو کہیں اور شائع کرا سکتے ہیں۔

☆ اگر اشاعت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے کہیں اور شائع ہو چکا ہے یا کسی اور کے مضمون کا سرقہ ہے مضمون نگار کو بلیک لسٹ کر دیا جائے گا۔ مستقبل میں اس کی کوئی تحریر شائع نہیں کی جائے گی۔

☆ یہ ایک خالص تحقیقی وتنقیدی جرنل ہے اس لیے اس میں تخلیقات نہیں شائع کی جاتی ہیں۔ لہذا افسانے اور غزلیں وغیرہ نہ بھیجیں۔

☆ اردو ریسرچ جرنل میں ریسرچ اسکالر کے مضامین بھی شائع کئے جاتے ہیں، ریسرچ اسکالر سے گزارش ہے کہ مضمون ارسال کرنے سے پہلے ایک بار اپنے اساتذہ کو ضرور دکھا لیں۔

☆ مضمون نگار حوالوں کی صحت کا خاص خیال رکھیں، بلا حوالہ کوئی بات نہ درج کریں۔

☆ جرنل کے لئے مضمون ارسال کرنے کے بعد اگر مضمون نگار کہیں اور شائع کرانا چاہیں تو اس کی اطلاع 'اردو ریسرچ جرنل' کو دیں۔

☆ اردو ریسرچ جرنل میں وہی مضامین شائع کئے جائیں گے جو تبصرہ نگاروں (Reviewers) کے ذریعہ قابل اشاعت قرار دئے جائیں گے۔

☆ تبصرہ کے لئے صرف کتابیں بھیجیں، ادارہ خود ان پر تبصرہ کرائے گا۔

☆ مضمون ان پیج یا ورڈ کی فائل میں ٹائپ شدہ ہونا چاہئے۔ پی ڈی ایف فائل یا ہارڈ کاپی قبول نہیں کی جائے گی۔

نگارشات اس ای میل پر بھیجیں:

E-mail:editor@urdulinks.com

مزید تفصیل کے لئے 'اردو ریسرچ جرنل' کی ویب سائٹ www.urdulinks.com دیکھیں۔

Approved by University of Tehran,Iran

اردو ریسرچ جرنل
Urdu Research Journal

Issue: 44
(October to December 2025)

بیادگار
پروفیسر ابن کنول
(سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی، انڈیا)

ایڈیٹر
ڈاکٹر عزیر اسرائیل
(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، وسابق ٹیچر انچارج اسلام پور کالج، نارتھ بنگال یونی ورسٹی، مغربی بنگال، انڈیا)

معاون ایڈیٹر
ڈاکٹر عبدالرحمن
(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، راجندر کالج، جے پرکاش یونی ورسٹی، چھپرہ، بہار، انڈیا)

مجلس مشاورت

ڈاکٹر احمد القاضی
شعبہ اردو، الازہر یونی ورسٹی، مصر

ڈاکٹر صابر گودڑ
سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، موریشس

ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، تہران یونی ورسٹی، ایران

ڈاکٹر سہیل عباس
پروفیسر شعبہ اردو، ٹوکیو یونی ورسٹی، جاپان

پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی
صدر شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی، لسان یونی ورسٹی، لکھنؤ، انڈیا

ڈاکٹر ابو شہیم خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد، انڈیا

ڈاکٹر محمد اکمل
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو خواجہ معین الدین چشتی، لسان یونی ورسٹی، لکھنؤ، انڈیا

ڈاکٹر رضی شہاب
صدر شعبہ اردو، مغربی بنگال اسٹیٹ یونی ورسٹی، باراسات، مغربی بنگال، انڈیا

ڈاکٹر محمد شہنواز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ اردو، اسلام پور کالج، نارتھ بنگال یونی ورسٹی، مغربی بنگال، انڈیا

اپنی نگارشات صرف ای میل پر ارسال کریں:
P-101/A. Gali No 2, The Aliya Coahcing Institute, Pahlwan Chawk, Batla House Delhi-110025
editor@urdulinks.com
Web: www.urdulinks.com/urj

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالتوں میں کی جاسکتی ہے۔

☆ اردو ریسرچ جرنل سے وابستہ افراد رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔

اداریہ

آہ پروفیسر عبدالحنان خان

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

[مرزا شوق لکھنوی]

دنیائے فانی کا اصول لافانی ہے کہ" ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے" اور یہ ایک ایسا سچ ہے کہ وقت مقررہ سے لمحے بھر نہ پہلے ہوتا ہے اور نہ بعد۔لیکن اچھے انسان کی یادیں وجود کو جھجھوڑتی ہیں اور احساس دلاتی ہیں۔کاش! کچھ لمحے، کچھ دن، کچھ سال اور ساتھ ملتا تو شاید ان خوش گوار یادوں میں مزید اضافہ ہوتا! اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرے! آمین

یقینا مربی ومحسن پروفیسر دیوان حنان کا سانحہ ایسا دل سوز ہے کہ اس کا مداوی کہیں اور سے ممکن نہیں۔بہر حال انسان مجبور محض ہے۔اللہ کے سوا کسی کے بس کا کچھ نہیں، بلکہ جو ہونا ہے وہ مقدر ہو چکا ہے۔اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔اس لیے اب دعائیں ہی سب سے کارآمد ہیں۔ اللہ تعالی مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے [آمین ثم آمین]

جسد خاکی فانی ہے، جس کے فنا ہوتے ہی سوائے تین چیزوں کے سارے اعمال منجمد ہو جاتے ہیں۔اللہ رب العالمین کا کرم ہے کہ دیوان حنان خان کو وہ تینوں چیزیں میسر ہیں۔یعنی صدقہ جاریہ، علم نافعہ اور اولاد صالح۔بس یہ سوچ کر دل مضطر کو بہلانا ممکن ہے کہ اللہ تبارک تعالی انھیں کے ذریعہ مرحوم کی بشری لغزشوں کو دور کرے گا، دن بدن جنت کے درجات بلند تر ہوتے جائیں گے۔اللہ تعالی جنت الفردوس میں بلند مقامات عطا کرے۔آمین

پروفیسر دیوان حنان خان یکم جنوری 1965 صوبہ بہار کے ضلع چین پور کے ایک مردم خیز گاؤں بیور میں پیدا ہوئے۔والد کا نام دیوان سہراب خان اور والدہ کا نام زیب النسا ہے۔این سی ای آر ٹی میں بحیثیت پروفیسر خدمت انجام دے رہے تھے۔کوڈ 19 کے اثرات کی وجہ سے سانس کی دشواری نے آگھیرا اور مستقل بیمار رہنے لگے۔بالآخر 26 نومبر 2025 کو میٹروہاسپیٹل سکٹر 11 نوئیڈا اتر پردیش، میں مالک حقیقی سے جا ملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے پس ماندگان میں دو بیٹیاں، صائمہ اور عارفہ اور ایک بیٹے زید خان ہیں۔اللہ تعالی ہم تمام احباب کو صبر اور اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھنے کی توفیق عطا کرے۔آمین

اے اللہ! غفور الرحیم! تو ان کی جانے انجانے خطاؤں کو معاف فرمادے اور ان کی جائے آرام کو اپنے رحمت سے سیراب کر اور ان کا ٹھکانا جنت بنا۔آمین

ڈاکٹر عبدالرحمن

اسسٹنٹ ایڈیٹر، اردو ریسرچ جرنل

اسسٹنٹ پروفیسر

راجندر کالج، جے پرکاش یونی ورسٹی، چھپرا

فہرست مضامین

ڈاکٹر عبدالرحمن اسسٹنٹ ایڈیٹر، اردو ریسرچ جرنل	اداریہ آہ پروفیسر عبدالحنان خان	4
پروفیسر ثوبان سعید پروفیسر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لسان یونیورسٹی، لکھنؤ	ڈپٹی نذیر احمد کی مکتوب نگاری	6
ڈاکٹر محمد اکمل ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لسان یونیورسٹی، لکھنؤ		
ڈاکٹر مقیم احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	سرلا دیوی کی افسانہ نگاری : افسانہ "عزت" کے خصوصی حوالے سے	17
ڈاکٹر عزیر احمد اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلام پور کالج، مغربی بنگال	رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس	25
کلیم احمد ریسرچ اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔	بلبل دکن: ماہ لقابائی چندا کی شعری روایت	37
عائشہ ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، ویر بہادر سنگھ پور وانچل یونیورسٹی، جونپور، یوپی	مولانا ظفر علی خاں: ایک تحقیقی جائزہ	48
ماجدہ بانو ریسرچ اسکالر، ڈی۔سی۔ایس۔کے ۔پی۔جی کالج، مئو	فن سوانح نگاری ایک مطالعہ	60

پروفیسر ثوبان سعید
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ
9411827716
saubansayeed@kmclu.ac.in

ڈاکٹر محمد اکمل
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ
7379480828
mohdakmal@kmclu.ac.in

ڈپٹی نذیر احمد کی مکتوب نگاری

Abstract

Deputy Nazir Ahmad (1836–1912) occupies a significant place in Urdu literary history as a pioneering novelist, translator, orator, and reformist thinker. His contribution to maktub nigari (letter writing) is equally noteworthy, particularly through his collection Mau'izah-e-Hasanah, which reflects his pedagogical and reformist vision. Unlike the ornate, Persianized style of early Urdu correspondence, Nazir Ahmad adopted a simple, direct, and communicative prose influenced by Delhi College and English literary models. His letters, primarily addressed to his son Bashiruddin Ahmad, reveal his emphasis on education, moral training, and character-building, underscoring his lifelong role as a teacher and reformer. This study situates Nazir Ahmad's epistolary practice within the broader evolution of

Urdu letter writing, tracing its transition from Persianized artificiality to colloquial clarity initiated by Ghalib and consolidated by Nazir Ahmad. His letters not only document personal and familial concerns but also embody the intellectual and cultural shifts of nineteenth-century North India. By examining their style, purpose, and historical context, the paper highlights Nazir Ahmad's enduring legacy in shaping Urdu prose and establishing maktub nigari as a vital genre of literary and social discourse.

Keywords: Deputy Nazir Ahmad, Urdu prose, maktub nigari, Mau'izah-e-Hasanah, Delhi College, reformist literature, epistolary tradition

Authors: Prof. Suban Syeed

پروفیسر ثوبان سعید
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

Email: saubansayeed@kmclu.ac.in | Mobile: 9411827716

Dr. Mohd Akmal

ڈاکٹر محمد اکمل
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

Email: mohdakmal@kmclu.ac.in | Mobile: 7379480828

اردو ادب کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت بڑی پہلودار اور مختلف الجہات ہے۔ زبان وادب کے میدان میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ ناول، تراجم، زبان وقواعد، منطق وکلام، اور خطابت کے میدان کے بڑے آدمی تھے۔ علی گڑھ کالج کے لیے چندہ اکٹھا کرنے، اور سرسید کے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے مختلف لکچر بھی دیے۔ سنہ 1918ء میں بشیر الدین احمد نے ان کے تمام لکچروں کو جمع کر کے دو جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ ان لکچروں کی مجموعی تعداد چوالیس ہے۔ انھی نذیر احمد نے اپنے بیٹے کو، جب وہ ملازمت کی غرض سے پردیس میں تھے، تعلیم دینے کی غرض سے مکتوب بھی لکھے۔ خطوط کا یہ مجموعہ ''موعظۂ حسنہ''

کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح سے خطوط نگاری کی صنف میں اپنے موضوعات واسلوب کی بدولت نذیر احمد اپنی جگہ محفوظ کر گئے۔

اردو میں مکتوباتی ادب کی تاریخ تقریباً دوسو برس پرانی ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق اردو کا پہلا خط سنہ 1803ء میں تحریر کیا گیا تھا، جس کی مکتوب نگار فقیرہ بیگم تھیں۔ [مکتوباتی ادب، شمس بدایونی، ص115] اردو کا پہلا مطبوعہ خط مرزا غالبؔ کا ہے جو اگست 1865ء میں نامۂ غالبؔ کے نام سے مطبعِ اموجان، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سنہ 1866ء میں ''انشائے اردو'' میں بعض اردو خطوط شامل ہوئے۔ آزادانہ طور پر خطوط کے مجموعے کی حیثیت سے مرزا غالبؔ کے خطوط ''عودِ ہندی'' کے نام سے اکتوبر سنہ 1868ء میں شائع ہوئے، اور جلد ہی دوسرا مجموعہ بھی ''اردوے معلیٰ'' کے نام سے مارچ سنہ 1869ء میں منظرِ عام پر آ گیا لیکن تب تک غالبؔ وفات پا چکے تھے، اور اس مجموعے کے دیدار کی حسرت لیے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ مجموعہ غالبؔ کی وفات کے 19 دن کے بعد شائع ہوا تھا۔

ہر ادب اپنے عہد کا زائیدہ ہوتا ہے، اس کی تخلیق اور ارتقا میں اس مخصوص عہد کے تقاضے اور روایات کی پوری جلوہ سامانی موجود ہوتی ہے۔ اردو میں مکتوب نگاری کی روایت جب قائم ہوئی تو دیگر اصناف کی طرز پر یہ صنف بھی فارسی زبان کے زیر اثر آگے بڑھی۔ چنانچہ جب ہم اس زاویے سے مکتوب نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ سے قبل اردو خطوط پر فارسی طرزِ انشا کی پوری چھاپ موجود تھی۔ فارسی زبان میں انشا اور رقعات کی ایک بڑی مضبوط اور توانا روایت رہی تھی جو سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ انحطاط پذیر تھی۔ اس کے باوجود اس کا طلسم ابھی پوری طرح سے ٹوٹا نہیں تھا۔ طبیعتوں پر فارسی انشا کا مصنوعی رنگ چھایا ہوا تھا۔ مزاجوں میں مشکل پسندی کا وہی انداز بے طرح رچا بسا تھا، اور اس کے نقوش تحریر وتقریر میں اپنے اثرات مرتب کر رہے تھے۔ ان خطوط اور رقعات کی جو زبان تھی، جو طرزِ اظہار تھا، یعنی مقفّیٰ اور مسجع عبارتوں کی مینا کاری، لمبے چوڑے القاب وآداب، لفظی خوبیوں اور ظاہری محاسن سے مرصع عبارت؛ یہی اسلوب اس وقت کی عام روش تھا، اور یہی مرصع نگاری علم وفضل کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ نے اپنی بیوی کو جو خط لکھا تھا، اس سے اس صورتِ حال کی ایک جھلک واضح ہو جائے گی:

''نامہ عنبر شمامہ، عطر آگیں، بہجت تزئیں، مفرح روح، مقوی دل، ممد جان،

معاون رواں سلسلۂ محبت،۔۔۔جامع پریشاں و بے پر، مایۂ صبر وقرار باعث
تسلی، دل غم خوار، مجاہد الدولہ کی معرفت پندرھویں ماہ صفر کو رونق افروز بزم
موصول ہوا کاشانۂ محبت روشن اور خانۂ الفت رشک وادیِ ایمن ہوا۔''

مقفّیٰ اور مسجع عبارت آرائی کا یہی اسلوب اردو مکتوب نگاری میں بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ چنانچہ غالبؔ سے پہلے جو مجموعے بھی سامنے آئے، مثلاً ''انشائے خرد افروز'' اور ''انشائے سرورؔ'' وغیرہ، سب میں یہی پرتکلف اور پرتصنع اسلوب کی جھلک صاف طور سے نظر آتی ہے۔

مکتوباتی ادب میں بعض حیثیتوں سے غالبؔ کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے، مثلاً انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، القاب وآداب کی قدیم روش سے اردو خطوط کو ایک نئی ڈگر پر لے آئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ غالبؔ روایت شکن شخصیت کے مالک تھے، اور ہر کوچے میں اپنا الگ راستہ نکال لیتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے مکتوب نگاری کے میدان میں بھی روایتی طریقے سے انحراف کیا، اور ایک ایسے طرز کو رواج دینے کی کوشش کی جو اچھوتا بھی تھا اور لائقِ تقلید بھی۔ لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دہلی کالج اور اس کے اثر سے صاف، سادہ اور رواں نثر لکھنے کا اسلوب بھی بڑی تیزی سے مقبول ہو رہا تھا۔ ماسٹر رام چندر کے مضامین اور مختلف اخبارات کی اشاعت بھی اس نئے اسلوب کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ پھر بھی غالبؔ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے زبان کی ترسیلی قوت کا اندازہ لگایا، بے تکلفی اور سادگی کی طاقت کو محسوس کیا، اور اردو نثر کو ایک نئی ڈگر پر لے آئے۔ سوانحی، تاریخی اور تہذیبی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ، اردو نثر کی تاریخ میں ان کے خطوط ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز بھی ہیں۔

غالبؔ کے بعد اس کوچے میں قدم رکھنے والوں میں غلام غوث بیخبرؔ کے علاوہ سرسید، نذیر احمد، محسن الملک، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، حالیؔ، داغؔ، امیرؔ مینائی کے نام آتے ہیں۔ اور اس کے بعد بھی مکتوب نگاروں کا ایک سلسلہ ہے جس میں مہدی افادی، سید سلیمان ندوی، اکبرؔ الہ آبادی، محمد علی جوہرؔ، اقبالؔ، اور ابوالکلام آزاد کے خطوط ادبی حیثیت سے اپنے اندر خاص دل کشی اور جاذبیت رکھتے ہیں۔ یہاں سبھی مکتوب نگاروں کا احاطہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس روایت کے تسلسل کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرنا ہے جس کا آغاز غالبؔ کے خطوط سے ہوا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے خطوط کا مجموعہ ''موعظۂ حسنہ'' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، اور ان کے خطوط غالبؔ کے سادہ، براہِ

راست اور بے تکلف اسلوبِ بیان کی توسیع شدہ شکل ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اگر نگاہ ڈالی جائے تو غالبؔ کے خطوط کے بعد رجب علی بیگ سرورؔ کا مجموعہ ''انشائے سرورؔ'' سنہ 1886ء میں منظرِ عام پر آیا تھا، اور اس کے صرف ایک برس بعد یعنی سنہ 1887ء میں ''موعظۂ حسنہ'' کی پہلی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ اس طرح سے مجموعۂ مکاتیب کو منظرِ عام پر لانے کے معاملے میں نذیر احمد کو اپنے ہم عصروں میں تقدم زمانی کا شرف حاصل ہے۔

نذیر احمد نے بھی غالبؔ کی طرح سیدھے اور راست اندازِ بیان کا سہارا لیا ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نذیر احمد کے خطوط پر غالبؔ کے طرزِ تحریر کے اثرات موجود ہیں، لیکن یہ خیال ظاہر کرتے ہوئے ہمیں نذیر احمد کے پس منظر کو سامنے رکھنا چاہیے کہ وہ دہلی کالج سے تعلیم یافتہ تھے، جہاں صاف، سادہ اور آسان زبان کا اسلوب فروغ پا رہا تھا۔ اور جہاں ان کے تعلقات ماسٹر رام چندر سے بھی تھے، جو مشکل پسند اور قدیم اسلوب کی سختی سے مخالفت کرتے تھے۔ لازمی طور سے نذیر احمد نے ان کے خیالات سے استفادہ کیا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ خطوط لکھے گئے تھے، اس وقت تک نذیر احمد انگریزی زبان سے واقفیت حاصل کر چکے تھے، اور انگریزی سیکھنے کے دوران وہ اس کے اسلوب اور طرزِ بیان سے بھی بہ خوبی واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''لو صاحب کی نصیحت تھی کہ چھوٹے چھوٹے جملے اور ایسے لفظ جو کثیر الاستعمال ہیں، اور جملے مختصر جن میں کوئی لفظ فضول نہ ہو لکھا کرو۔ دیکھو تمھاری چٹھی میں جو لفظ میں نے قلم زد کیے، فضول ہیں کہ بے ان کے بھی کام چل سکتا ہے۔''
>
> [خط 10]

ایک دوسرے خط میں انگریزی زبان کی سادگی، حقیقت پسندی، اردو کی اثر پذیری، اور فارسی زبان کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انگریزی میں ابتذال اور خوشامد اور مبالغہ اور جھوٹ نہیں۔ ہمارے یہاں بیسیوں انشائیں صرف القاب آداب، معمولی خیر وعافیت، رسمی شوق وانتظار کے لیے پڑھنی پڑتی ہیں۔۔۔ فارسی لٹریچر نے ہماری تہذیب کو بالکل برباد

کر دیا تھا۔اب اردو پر انگریزی رنگ آتا چلا ہے۔زبان مبالغے اور ابتذال کے عیوب سے بہت پاک ہوگئی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔سیدھی اور صاف بات میں لوگوں کو مزہ ملنے لگا ہے۔غرض انگریزی نے ہر ایک کے کان میں پھونک دیا ہے کہ وہ بھی آدمی ہے، جان اور مال اور عزت رکھتا ہے، اس کے سب حقوق محفوظ ہیں۔"[خط 106]

غالبؔ کے خطوط کا مقصد بہت واضح تھا۔وہ یار باش قسم کے آدمی تھے۔جب دہلی کی مجلسی زندگی کی بساط اٹھ گئی، اور ان کے دوست احباب گردشِ زمانہ کی کج روی کا شکار ہو گئے تو ناچار غالبؔ کو مکتوب نگاری کا سہارا لینا پڑا۔اور عالمِ تخیل میں انھوں نے مجلس آرائی کا اہتمام کیا۔تفریح اور یار باشی کا ایک نیا طرز نکالا، چنانچہ ان کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ اپنی اور مکتوب الیہ کی تفریحِ طبع کی خاطر خط لکھتے تھے۔ظرافت ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔باوجود اس کے کہ ان کے خطوط میں موضوعات کا تنوع اور رنگا رنگی ہے، اور اس میں ہر قسم کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، لیکن غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے خیالات کے اظہار میں اپنے مخصوص مزاج اور ظرافت کے رنگ کی بدولت لذت وانبساط کی روح بھر دیتے تھے۔غالبؔ کو ایک آزادی اور بھی حاصل تھی کہ ان کے مکتوب الیہ میں مختلف حیثیتوں کے لوگ شامل تھے۔ان میں احباب بھی تھے، شاگرد بھی تھے، ریاستوں کے سربراہ بھی تھے اور معزز لوگ بھی تھے۔

غالبؔ کے برخلاف نذیر احمد کے خطوط میں بہت ہی محدود لوگ شامل ہیں، ان کے مکتوب الیہم کے تعداد بہت معمولی ہے، مثلاً چند ایک خط بیوی صاحب کے نام ہیں، ایک خط ملازم سبحان بخش کے نام ہے، ایک آدھ خط ریڈ صاحب کے نام ہے، اور بیش تر خطوط اپنے بیٹے بشیر الدین احمد کے نام ہیں۔نذیر احمد کی کوئی تحریر تعمیری مقصد سے خالی نہیں ہوتی تھی۔یہاں بھی ان کے سامنے ایک مشن تھا تعلیم کا تربیت کا اور اصلاح کا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام خطوط ایک خاص مقصد کے تحت تحریر کیے گئے تھے، اور مقصد بھی بہت عظیم اور مہتم بالشان تھا، یعنی اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت، اور اخلاق سازی۔تمام خطوط میں کہیں تعلیم کے اصول بتائے گئے ہیں، کہیں اخلاق کے فلسفے سمجھائے گئے ہیں، کہیں واعظانہ رنگ موجود ہے، کہیں شادی بیاہ کی ترغیب دی گئی ہے۔غرض یہ کہ ہر جگہ تعلیم وتربیت ہی اصل مقصد ہے، اور اس مقصد کو نذیر احمد کبھی بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔اس مقصد کو

حاصل کرنے کے لیے نذیر احمد نے بھی زبان کی اسی ترسیلی قوت کا سہارا لیا جو سیدھے سادے اسلوب کے پردے میں دلوں پر اپنے نقوش مرتب کرتی ہے۔

نذیر احمد بنیادی طور سے ایک معلم تھے، وہ زندگی بھر معلم رہے، معلمِ اخلاق؛ اور یہ حیثیت ان کی تمام تر تصنیفات میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ موعظہ میں جن موضوعات کو بھی پیش کیا گیا ہے، ان میں زیادہ تر تعلیم وتعلم اور تربیت کے دائرے میں آتے ہیں۔ بعض خطوط میں اگرچہ خانگی معاملات ومسائل بھی بیان کیے گئے ہیں، اور بعض میں ان کے متعلقین اور احباب کا ذکر بھی ہوا ہے لیکن ان سب کی ضمنی حیثیت ہے۔ جتنے بھی خطوط ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی مکتوب الیہ سے ہو، ان میں تعلیم وتربیت کے حصول کی روح دوڑتی نظر آتی ہے، اور شخصیت وکردار سازی اور اصلاح کا مقصد ہی ان کا نصب العین رہا ہے۔ بعض خطوط شخصی اور سوانحی نوعیت کے ہیں جن سے نذیر احمد کی شخصیت وسیرت کے بہت سارے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شخصیت، کردار، طرزِ زندگی اور فلسفۂ حیات پر گفتگو کرتے ہوئے ان خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر نذیر احمد مسلمانوں میں تجارت کا شوق پیدا کرنا چاہتے تھے، اور ان کی خواہش تھی کہ مسلمان بھی تجارت کے میدان میں اپنی قسمت اور زورِ بازو کے بل بوتے پر اپنی معاشی زندگی کو بہتر بنائیں۔ اس سے دو فائدے مرتب ہوں گے۔ پہلا یہ کہ لوگ تجارت کی طرف راغب ہو کر اپنے اوقات کا بہترین مصرف نکالتے، اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ مصروفیت اور کام میں مشغولیت کی وجہ سے بے کاری اور بے عملی سے نجات بھی ملتی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے شہر کے مسلمانوں میں پنجابی، جن کا پیشہ تجارت ہے، اچھّا مقدور رکھتے ہیں، اور خوش حال ہیں۔۔۔ کیا سبب ہے کہ اِن کے نوجوان لڑکے ہم ہندوستانیوں کے لڑکوں کی طرح آوارہ نہیں ہوتے؟ آخر یہ بات معلوم ہوئی کہ اِن کے لڑکے شروع سے بڑوں کو دیکھتے ہیں کہ دولت کے بڑھانے کے پیچھے پڑے ہیں، اِس سے دولت کی قدر بچپن سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ پھر اِن کا پیشہ کچھ اِس طرح کے اِبتلا کا پیشہ ہے کہ مال کی نکاسی اور اُگاہی اور تقاضے اور فرمایش اور حساب وکتاب کے فکر سے کسی وقت نجات نہیں۔ یہ اشتغال اور انہماک اِن کے لڑکوں کو نہیں بگڑنے دیتا۔''[خط 100]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''صرف نوکری کے ذریعے سے آدمی مال دار ہو نہیں سکتا۔۔۔ ہاں نوکری کے ذریعے سے جو لوگ مال دار ہوئے اس تدبیر سے ہوئے کہ ایک کو خدا نے برکت دی اور دوسرے عزیز اس کی کمائی کو زمین داری یا تجارت سے ترقی دیتے رہے، رفتہ رفتہ سرمایۂ معتدبہ جمع ہوگیا۔''[خط 84]

اپنے سرمایے کو محفوظ رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کی غرض سے نذیر احمد تجارت کے علاوہ پرامیسری نوٹ بھی خریدتے تھے، اور اس کے جواز کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک خط میں فرماتے ہیں:

''جس شخص کے اصولِ زندگی یہ رہے ہوں کہ اپنی آمد سے خرچ کو بڑھنے نہ دے، یعنی ہمیشہ تھوڑا بہت پس انداز کرتا رہے، اور روپیے کو پتھر بنا کر رکھ چھوڑنے کو جنون سمجھے۔۔۔ ایسا آدمی اپنے اندوختے کو پرامیسری نوٹوں کے پیرایے میں نہ رکھے تو کیا کرے۔''[خط 84]

نذیر احمد سود لینے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے:

''اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے۔۔۔ میں نے کہا: مولوی صاحب! لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں، اور لیتے ہیں کس سے، اپنے شاگردوں سے۔ کہنے لگے: اس کی پروانہ کرو۔ جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا! جاؤ تمھارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑا لیتا ہوں، تم سے چودہ آنے لوں گا۔''[نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ص 41]

نذیر احمد کے مخالفین نے ان کی سیرت وشخصیت پر بخل اور کنجوسی کا الزام لگا کر ان کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس الزام تراشی کو اس قدر منظم انداز سے، اور مکرر انجام دیا گیا کہ بعض لوگوں کو اس پر یقین بھی آ گیا۔ فرحت اللہ بیگ کے خاکے نے بھی ان کی شخصیت کے اس پہلو کو خاص طور سے پیش کیا، لیکن جب ہم موعظۂ حسنہ کی روشنی میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روبرو ہوتے ہیں تو اس کی وقعت ایک الزام

سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔مختلف خطوط سے چند مثالیں ہی کافی ہوں گی:

''میرا روپیہ جہاں تک تمھاری آسایش میں صرف ہو، انشاء اللہ مجھ کو دریغ نہیں۔اگر تم کو نام ونمود کا آدمی کرے تو میرا روپیہ اچھے نیگ لگا۔مجھ کو ایسے خرچ سے ہمیشہ خوشی ہے۔تم اپنی والدہ سے بے تکلف خرچ لو،لیکن اگر ان کے پاس نہ ہوتو مجھ سے مانگنے میں بھی تامل مت کرو۔''[خط2]

☆☆☆

''تُف ہے میری دولت پر، اور لعنت میرے مال دار ہونے پر، جب میری پیاری اولاد اِس وجہ سے تکلیف پائے کہ میں اُن کی حاجت کی قدر باوجودِ مقدرَت روپیہ نہیں دیتا۔خدا کی قسم میں یہی سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میرے پاس ہے،اِن بچّوں کی امانت ہے۔پس افسوس ہے کہ جن کا روپیہ اُنھی پر خرچ نہ کیا جائے۔''[خط54]

☆☆☆

''میں نے مدرَسۃُ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہوس بنوایا۔دو کوٹھے ہیں، دونوں میں چندہ دیا۔اپنے سارے خاندان کے نام کی جالیاں اِحاطۂ مدرَسہ میں نصب کرائیں۔''[خط106]

مولوی نذیر احمد کی طبیعت اور مزاج کا ایک خاص رنگ تھا۔انھیں زمانہ سازی بالکل نہیں آتی تھی۔وہ اپنے مافی الضمیر کو بغیر کسی لاگ لپیٹ اور مصلحت سے کہنے کی ہمت رکھتے تھے۔نفع نقصان کی کچھ پروانہ کرتے تھے،مثلاً سرسید کی عبقری شخصیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے اختلافات ظاہر کرنے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتے۔ محسن الملک بڑی وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ایک زمانے میں سرکارِ نظام میں ان کا طوطی بولتا تھا۔نذیر احمد کو حیدرآباد بلانے میں ان کی کوششوں اور تقریب کا دخل تھا۔مولوی صاحب کو جب مرآۃ العروس کا انعام سنہ 1869ء میں ملنے والا تھا تو کسی بات کو لے کر نذیر احمد محسن الملک سے چٹک گئے اور اپنی طبیعت کے زور پر قابو نہیں رکھ سکے۔

نذیر احمد کی فکر ونظر کا افق بھی وسیع تھا۔ وہ زندگی کے تمام معاملات میں ایک سچی تلی اور متوازن رائے رکھتے تھے۔ مذہبی تعلیم اور فکر نے ان کی شخصیت میں ایک قسم کی جرأت مندی اور بے باکی کا عنصر شامل کر دیا تھا، اور دہلی کالج نے سائنسی فکر، منطقی استدلال اور ترقی پسندی کے عناصر کی تشکیل کی تھی۔ موعظۂ حسنہ کی روشنی میں نذیر احمد کی پوری شخصیت اصلی رنگ میں ہمارے سامنے نظر آتی ہے۔ ان کے اسلوب میں بھی ان کی شخصیت و کردار کے مختلف نقوش کی کارفرمائی موجود ہے۔ نذیر احمد عربی فارسی کے عالم تھے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ وہ روزمرہ اور محاوروں کا بے تکان استعمال کرتے تھے۔ ناولوں سے قطع نظر خطوط میں بھی ان کے اسلوب کی یہی انفرادیت موجود ہے۔ خطوط میں انسان بالکل اپنے فطری انداز میں سوچتا ہے، اور اپنے خیالات کو بے کم وکاست الفاظ کے قالب میں ڈھالتا جاتا ہے، اس میں تصنع اور آورد کی کوئی جھلک نہیں ہوتی۔ اس نقطۂ نظر کی روشنی میں نذیر احمد کے خطوط دراصل ان کی شخصیت اور مزاج کے بہترین عکاس ہیں۔ ان کے مزاج میں ظرافت کا عنصر بہت زیادہ تھا، اور یہ رنگ خطابت کے دوران مزید تیز ہو جاتا۔ نذیر احمد نے خطوط میں بھی اس خوبی کو برقرار رکھا ہے۔

نذیر احمد انگریزی زبان کی خوبیوں کے معترف تھے، اس کی سادگی اور قوتِ ترسیل پر فدا تھے۔ چنانچہ انھوں نے خطوط نویسی کے دوران القاب وآداب کی وہ قدیم روش یکسر ترک کر دی جو فارسی طرزِ انشا سے عبارت تھی۔ اس معاملے میں وہ غالبؔ کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد نہ صرف اصولی طور پر انگریزی طرز انشا کے قائل تھے بلکہ عملی طور پر بھی اسی سادگی اور اختصار نویسی کی روایت کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ابتدائی چند خطوط کو چھوڑ کر باقی کہیں بھی القاب وآداب کی پابندی نہیں کی گئی ہے، اور براہِ راست مقصد کا اظہار کر دیا گیا ہے۔ جن خطوط میں القاب وآداب موجود ہیں ان میں بھی سادگی اور اختصار کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے، مثلاً بعض خطوط میں 'نور چشما!' یا 'بشیر الدین احمد' کے علاوہ مختصر دعائیہ جملوں کا استعمال ہوا ہے۔ ایک خط میں 'اجی حضرت!' چند خطوط میں 'بشیر!'، ایک خط میں 'شاباش، میاں بشیر!' جیسے مختصر القاب موجود ہیں۔ مختصراً یہ کہ غالبؔ نے سادہ پسندی اور بے تکلفی کا جو انداز اپنایا تھا، وہ نذیر احمد کے خطوط میں اپنی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔

غرض یہ کہ موعظۂ حسنہ میں مولوی نذیر احمد کی شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلو ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے طریقۂ تعلیم وتدریس کا معاملہ ہو، یا خانگی معاملات ومسائل کے بارے میں ان کی رائے کا، عورتوں کی آزادی اور تربیت کا مسئلہ ہو یا خاندانی نظام کے تعلق سے ان کے تصورات کا۔ انگریزی حکومت، طرزِ انتظام کی

خوبیوں کا بیان ہو یا انگریزی تمدن کی خامیوں کا ذکر، سلطنتِ حیدرآباد کی خوش حالی کا قصیدہ ہو یا وہاں کے طرزِ انتظام اور سازشوں اور فریب کاریوں کا تذکرہ؛ نذیر احمد ہر رنگ میں اپنے منفرد اور جان دار اسلوب کی بدولت بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

ایک بات اور بھی ہے کہ گذشتہ سوا سو برس میں زمانے نے بہت انقلابات دیکھے ہیں، زمانہ بدل گیا، ذہن بدل گیا، اندازِ نظر بدل گیا، تعلیم کا نظام بدل گیا، تعلیم کے معیار تبدیل ہو گئے، سائنس اور ٹکنالوجی کی ایجادات نے ہر مضمون اور ہر موضوع کو نئے طرز سے سیکھنے سکھانے کے آداب سکھائے ہیں، اس کے باوجود موعظۂ حسنہ میں نذیر احمد نے تعلیم وتدریس کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اور جس جس تدبیر سے اپنے لختِ جگر کو تعلیم دیتے تھے، اخلاق اور کردار کی جو اعلیٰ اقدار اپنے بیٹے کی شخصیت میں دیکھنا چاہتے تھے، اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی اس معیار کی چمک پھیکی نہیں پڑی ہے، اور اس میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں ہو سکی ہے۔ موعظۂ حسنہ کی یہی خوبی اس کی افادیت اور معنویت میں چار چاند لگاتی ہے، اور مکتوباتی ادب کی تاریخ میں نذیر احمد کی کاوشوں کو یادگار بناتی ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

1. موعظہ حسنہ، ڈپٹی نذیر احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
2. نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی، فرحت اللہ بیگ، انجمن ترقی اردو، دہلی
3. مکتوباتی ادب، شمس بدایونی، بریلی
4. مشاہیر کی آپ بیتیاں، عظیم الشان صدیقی، دہلی
5. چند ادبی شخصیتیں، شاہد احمد دہلوی، دہلی
6. مکتوبات اردو کا ادبی وتاریخی ارتقا، خواجہ احمد فاروقی، نئی دہلی

***

ڈاکٹر مقیم احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سرلا دیوی کی افسانہ نگاری: افسانہ "عزت" کے خصوصی حوالے سے

Abstract

This paper by Dr. Muqeem Ahmad examines the literary contributions of Sarla Devi, with particular emphasis on her short story Izzat. Born into a family of progressive writers, Sarla Devi's fiction reflects the socio-political upheavals of post-Partition India, blending romantic undertones with social realism. Her narratives consistently highlight communal violence, displacement, poverty, and the exploitation of women under patriarchal and religious authority. In Izzzat she exposes the hypocrisy of religious figures who exploit faith to manipulate women, while simultaneously portraying the crushing impact of poverty and social prejudice. Through characters such as Emily, Sarla Devi reveals the intersection of gender, class, and communal identity, questioning the moral fabric of society and critiquing the structures that perpetuate oppression. Although

her literary output was limited compared to her contemporaries, her work remains a significant example of progressive Urdu fiction, advocating humanism, equality, and social justice. Dr. Muqeem Ahmad situates Sarla Devi as an underrecognized yet vital figure in the evolution of post-Partition Urdu literature, whose empathetic portrayal of women's struggles and critique of communalism enriches the tradition of social realism in Urdu short stories .

Keywords

Dr. Muqeem Ahmad, Sarla Devi, Urdu fiction,Izzat,Partition literature, communal violence, poverty, gender oppression, progressive movement, social realism, humanism, women's struggles

Auther: **Dr.Moqeem Ahmad**

I .23 forth Floor, Abul Fazal Enclave

Jamia Nagar Okhla, New Delhi. 110025

Mob: 9999555676

سرلا دیوی کی ولادت 1928ء ضلع پونچھ، ریاست جموں وکشمیر میں ہوئی۔ان کا گھرانا اردو زبان وادب کا گہوارہ تھا۔اردو ادب کے مایہ ناز افسانہ نگار کرشن چندر اور مہندر ناتھ ان کے حقیقی بھائی ہیں۔مشہور ڈراما نویس ریوتی سرن شرما ان کے شوہر تھے۔سرلا دیوی کے دونوں بھائی اور شوہر ترقی پسند تحریک کے سرگرم تخلیق

کاروں میں سے ہیں۔ان کے علاوہ سرلا دیوی خود بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں۔ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں رومانی تحریک کی جھلک بھی موجود ہے۔لیکن تقسیم ہند کے بعد رونما حالات کی ترجمانی ان کے افسانوں کی اصل روح ہے۔انھوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا ہے مگر جتنا لکھا، اس سے ان کی ایک الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ان کا پہلا افسانہ 'کلنک' رسالہ 'ساقی' میں شائع ہوا۔ پہلا افسانوی مجموعہ بھی 'کلنک' کے نام سے 1949 میں شائع ہوا اور دوسرا افسانوی مجموعہ 'چاند بجھ گیا' 1954 میں منظر عام پر آیا۔

دہلی کی خواتین افسانہ نگاروں میں سرلا دیوی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر جو شہرت و ناموری اس عہد کی دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے حصے میں آئی وہ انہیں میسر نہیں ہوئی۔ان کے بیشتر افسانوں کے موضوعات نسائی حسیت، تقسیم ہند کے بعد ہندو مسلم فسادات اور مہاجرین کے حالات پر مبنی ہیں۔ش۔اختر ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> 'قرۃ العین حیدر کے بعد سرلا دیوی اردو کی واحد افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے تقسیم ہند، ہندو مسلم فسادات اور اس کے نتائج کو اپنا خصوصی موضوع بنایا ہے۔'
>
> 1

حقیقت ہے کہ سرلا دیوی کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی بحران کا عہد ہے۔تقسیم ہند کے بعد رونما حالات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ایک فرقہ پرستوں کی جماعت اور دوسرے انسانی قدروں کے محافظین اور بہی خواہ؛ جو اپنی زندگی کو جھولیوں میں لیے گھوم رہے تھے۔سرلا دیوی نے اپنی تحریروں میں انھیں گروہوں کی عکاسی کی ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح لوگ مذہب کی آڑ میں انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کی عزت و ناموس کو پامال کرتے ہیں۔ ملک میں ایک دور وہ بھی آیا، جب فسادات بظاہر تھم سے گئے، لیکن موقع پرستوں نے انسانیت کو مجروح کرنے کے لیے میدان تیار کر رکھا تھا۔ایسے میں سرلا دیوی نے خود کو انسان دوستی کا علمبردار بنایا اور اپنے فن پاروں میں انسانی ہمدردی کو پروان چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی؛ جو محض ہمدردی اور خلوص کے علاوہ ان کی ذہنی وسعت کی غماز ہے۔اور ہماری سماجی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی حقیقی قدروں کی تشکیل کرتی ہے۔خواجہ احمد عباس 'چاند بجھ گیا' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

'ان کے بہترین افسانے وہاں سے شروع ہوتے ہیں، جہاں رومانیت ختم ہوکر حقیقت نگاری کی سنگلاخ سطح پر آجاتی ہے۔' 2؎

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرلا دیوی نے ادبی تحریکات ورجحانات کو بڑے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے اسی لیے ان کے افسانوں میں رومانیت اور اشتراکیت دونوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں ان کے خاندانی پس منظر پرنظر ڈالنے سے ان کی ذہنی افتاد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور معلوم ہوگا کہ ان کا پورا گھرانا رومانویت اور اشتراکیت کا علمبردار ہے۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ اور ریوتی شرن کے فن پاروں کا مطالعہ کریں تو ان کے یہاں بھی وہی رجحان ہے جو سرلا دیوی کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایسی انسان دوستی کی خواہاں نظر آتی ہیں جو مذہب وملت کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے سے محبت کرے۔ وہ ایسے ہندوستان کی امید کرتی ہیں جہاں انسان صرف انسان ہو۔ اس کے دل میں مذہب وملت کی کھائی نہ ہو۔ افسانہ 'شاردا' کا یہ اقتباس دیکھیں:

'جب تم پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھو گی، جب تم کو تمہارے تعصّبات کا بھوت ستائے گا تب ہی تم مجھے اپنے سے علیحدہ اور مسلمان سمجھو گی۔ جب تک ہم آگے ایک سائق کی طرف تکتے رہیں گے تب تک ہمیں کبھی محسوس نہ ہوگا کے ہم ہندو اور مسلمان ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمہیں ایک ہی چیز چبھنی ہوگی۔ ہمیشہ کے لیے کبھی نہ پچھتانے کے ارادے سے اور وہ یہ کہ پیدائش اور مذہب کی بنا پر آدمی سے نفرت نہیں کروگی۔'

3؎

اس اقتباس سے سرلا دیوی کے اشتراکی رجحان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ مذہب وملت کی آڑ میں ہورہے ظلم واستبداد اور منافرت کی کھائی کو انسانیت کے مرہم سے بھرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک تمام فسادات اور مسئلوں کا واحد حل اشتراکی نظام ہے۔ یعنی اگر انسان طبقہ، رنگ، نسل، قومیت کے خانوں سے آزاد ہو جائے اور فقط انسانیت کی بنیاد پر آپس میں مل کر زندگی اختیار کرے تو اس سے ایک ایسے صحت مند سماج کی بنیاد قائم ہوگی جس میں منافرت کے بجائے خلوص، رفاقت اور بھائی چارہ ہوگا۔

افسانہ 'عزت' میں سرلا دیوی نے سماج کے ان سفاک چہروں کو بے نقاب کیا ہے جو مذہب کی آڑ میں

لوگوں کی عزت وناموس کو تار کرتے ہیں۔اور معصوم عوام کرامات سمجھ کر وہ سب بخوشی قبول کرتی ہے اور ان کے گن گان کرتی ہے۔انھیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ مذہب کی آڑ میں وحشی درندے اپنے نفس کی پیاس بجھانے کے لیے آشرم کا سہارا لیتے ہیں۔مذہب کے نام پر عورتوں کو بے وقوف بنا کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور بے وقوف عورتیں سمجھتی ہیں کہ بابا کی چٹکی کی کرامت ہے۔

یہاں سرلا دیوی نے برسوں پہلے آج کی تصویر پیش کی ہے۔ جہاں مذہب کے نام پر عورتوں کی عزت وناموس کو داغدار کیا جاتا ہے۔اور یہ سب حصول اولاد کی خواہش میں بیکل لوگوں کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ پہلو اس افسانے کا ایک رخ ہے، جسے بابا رام کشن کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔دوسرا رخ پیسے کی تنگی، مفلسی، غریبی اور بے بسی ہے جو انسان کو وہ کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جو اُس نے کبھی سوچا بھی نہ ہو۔ افسانے میں ایملی کا کردار بہت اہم ہے جس کی ماں کٹّر برہمن تھی لیکن اُس کا دل ایملی کے باپ پر آجاتا ہے اور وہ اس سے شادی کر لیتی ہے اور وہ شوہر کی نازیبا حرکتوں سے تنگ آکر اپنا مذہب بدل کر عیسائی ہو جاتی ہے۔اس کی بیٹی ایملی بہت خوبصورت ہے۔تنگی اسباب کی وجہ سے ان کوارٹرز میں رہائش پذیر ہے، جو رائے بہادر موہن لال نے دو دو کمروں کے بنوا کر بے گھر لوگوں پر احسان کر رکھا تھا۔کوارٹروں میں رہنے والے سب ہندو تھے، لیکن مندر نہیں جاتے تھے بلکہ صرف ملنے آتے تا کہ وہ ان کی عورتوں کو اولاد کی دولت سے مالا مال کر سکیں۔

ایملی جب برآمدے میں آتی تھی تو کوارٹرز کے نوجوان لڑکے اس پر فقرہ بازی کیا کرتے۔ کیوں کہ غیر مذہب کے ماننے والوں کا آنا جانا ان مکینوں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ان کی آمد ورفت سے ہندوؤں کا دھرم بھرشٹ ہوتا تھا۔ان کے بچے بگڑنے لگے تھے۔اس کی سب سے بڑی وجہ ایملی کی تعلیم وتربیت سے آراستگی اور اندھ بھگتی کے بجائے اپنے ذہن ودماغ اور حقیقی اقدار کی علمبرداری تھی۔سرلا دیوی لکھتی ہیں:

> 'کوارٹروں میں رہنے والے ہندو بوڑھے اس عیسائی فیملی کے آجانے سے بہت ناخوش تھے۔اس سے ایک طرف تو انہیں اپنے لڑکوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ، پھر وہ چھوت چھات کے بڑے قائل تھے۔ان کی عورتیں ہمیشہ ساڑی کو پنڈلی پر سے اوپر اٹھا کر چلتی تھیں کہ کسی ناپاک چیز سے ان کا دامن نہ چھو جائے۔ چاہے جسم ننگا ہو جائے لیکن چھوت چھات زندہ باد' 4۔

چھوت چھات کا اتنا وہم کہ بدن ننگا ہو جائے لیکن چھوت چھات کو زندہ رکھنا ہے۔ یہ ہے وہ مذہبی کٹر پن، جس کو سرلا دیوی نے بخوبی پیش کیا ہے۔ جب ایملی اور اوشا کی گہری دوستی ہو گئی تو لوگ ان کے بارے میں بے تکی باتیں کر کے ایملی کو بدنام کرنے لگے۔ محلے کے جج صاحب سب سے زیادہ باتیں بناتے تھے، انھیں بھی ایملی سے اس لیے چڑ تھی کہ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ جج صاحب نے ایملی کو کئی مرتبہ گلدستے بھی بھیجے لیکن ایملی نے ہمیشہ واپس کر دیے۔ آخر کار جج صاحب نے ایک راستہ نکالا اور انھوں نے ایملی کے والد سے تعلقات بڑھانے شروع کیے، جس کی وجہ سے وہ اب ایملی کے گھر جانے لگے تھے اور کچھ دن بعد اچانک ایملی کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اب لوگوں کے دل میں ایملی کے متعلق رہا سہا لحاظ بھی جاتا رہا اور اب وہ بنا کسی جھجک کے ایملی سے مذاق کرتے۔ ایک اور اقتباس دیکھیں:

> 'ایملی دوسری لڑکیوں کی طرح ان نوجوانوں کو دیکھ کر جھجکتی نہیں تھی۔ وہ بے نیازی سے گزر جاتی۔ اس سے ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ عیسائی لڑکیاں چٹکی بجاتے ہی بغل میں آجاتی ہیں۔ وہ چلاتے 'ذات کی عیسائی اور نخرے دیکھو' اور پھر دھیرے سے کہتے 'حرام زادی'۔ 5؎

اس اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جن ہندو مذہب کے ماننے والے والدین ایملی کو اپنے لڑکے بگاڑنے کا طعنہ دے رہے تھے، ان کے لڑکوں کی تربیت کا اندازہ لگائیں۔ ایک لڑکی کو دیکھ کر نازیبا گفتگو اور اوچھی حرکتیں کرتے ہیں۔ سرلا دیوی ایک طرح کا سوال قائم کرتی ہیں کہ جو بچے کسی غیر کی عزت نہیں کر سکتے وہ ایک اچھے سماج کا حصہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ انھیں مہذب اور اعلی اقدار کا حامل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں سرلا دیوی نے نوجوان بچوں کی حرکتوں کے ذریعہ خود کو مہذب اور اعلی اقدار کا ٹھیکیدار سمجھنے والے سماج کی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> اور آج دو وقت سے ایملی نے کچھ کھایا نہ تھا۔ ماں الگ صاحب فراش تھی۔ اتنے میں جج صاحب آن پہنچے۔ ایملی رو پڑی۔ جج صاحب نوٹ چھوڑ گئے اور کہہ گئے کہ میں پھر آؤں گا۔ ایملی بیٹھی ان نوٹوں کو تکتی رہی۔ بھوک، دوا، دو۔۔۔ محبت، محبت۔۔۔ دوا اور ۔۔۔۔ بھوک

۔۔۔۔پھر رات آ گئی۔گہری اور ایملی کے نصیب کی طرح تاریک اور اس
میں احمد کے محبت کی کرن اور ایملی کی ماں کی آخری سانس۔"6۔

سرلا دیوی نے بھوک، افلاس اور تنگدستی کو معاشرے کا ناسور بتایا ہے اور ان کے بیشتر افسانے تنگدستی کے شکار معاشرے کے ترجمان نظر آتے ہیں جس میں بہت سے خاندان غریبی کے سبب اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں کر پاتے اور نہ ہی بچوں کی پرورش کر پاتے ہیں بلکہ ہر شے اور خوشی سے جی مار کر زندگی بسر کرتے ہیں۔گویا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غریب ہونا ایک لعنت ہے۔سرلا دیوی نے یہاں جج کو انصاف کی مورتی نہ بنا کر ایک عام انسان، وہ بھی نفسانی خواہشات رکھنے والا اور دوسری لڑکیوں پر فقرے بازی کرنے والے مرد کے طور پر پیش کیا ہے۔جس رات کا ذکر سرلا دیوی نے کیا ہے اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ایملی نے جج سے شادی کر لی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تنگدستی اور بھوک اور ماں کی بیماری سے مجبور ہو کر ایملی نے خود کو فروخت کر دیا۔

سرلا دیوی کے افسانوی مجموعے' کلنک' میں شامل بیشتر افسانے عورت سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں معاشرہ ظالم اور عورت ایک مظلوم کے طور پر سامنے آتی ہے۔سرلا دیوی نے اپنے افسانوں کا موضوع تقسیم ہند کو بنایا ہے اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے' جب آزادی کے دیپک جھلملائے' میں انھوں نے تقسیم سے رونما ہونے والے ہندو مسلم فسادات میں جو بربریت اور دردانگیز مناظر سلطانہ اور پربھا کے کردار کے ذریعے پیش کیے ہیں، ان کو پڑھ کر روح کانپ جاتی ہے۔ پربھا اور سلطانہ کی اندوہناک داستان سن کر بہت رنج ہوتا ہے اور تقسیم کا یہ ناسور دل میں پھر ایک چبھن پیدا کرتا ہے۔اس کے علاوہ افسانہ' کلنک' اور' شاہراہ' میں مرد کی بے وفائی کی وجہ سے۔عورت کن چیزوں اور سماج کے لوگ اس کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں اس کا ذکر ہے۔دھوکے باز مرد، عورت کو کس طرح اپنے جال میں پھنسا کر لطف لیتے ہیں اور عورتوں کی عزت سے کھیلتے ہیں، سرلا دیوی نے ان سب حقائق کا بیان بخوبی کیا ہے، جس سے عورت کے تئیں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔افسانہ' عزت' اولاد کی خواہش اور غریبی سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے ذریعے سرلا دیوی نے بابا رام کشن جیسے دوسرے سادھوؤں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے کہ کس طرح یہ لوگ مذہب کی آڑ میں برے کام کرتے ہیں اور اگر یہی کام وہ عورتیں اور سٹھانیاں کسی اور کے ساتھ کریں تو یہی سماج جو بابا کے گن گا رہا ہے عورت کو زندہ درگور کر دیتا، لیکن یہاں مذہب آڑے آجاتا ہے۔دوسرا موضوع مفلسی اور بے بسی ہے۔لوگ دوسروں کی مجبوریوں کا فائدہ اُٹھا کر اپنا مطلب

پورا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔سرلا دیوی کا زمانہ ہندوستان کے لیے ایک عظیم سیاسی،سماجی اور تہذیبی بحران کا زمانہ تھا اور یہ بحران ان کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجو ہے۔

سرلا دیوی کے افسانے سماجی اور رومانی حقیقت نگاری کی اچھی مثال پیش کرتے ہے۔سرلا دیوی نے کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے، اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ان کے افسانوں کے واقعات 1947 کے بعد کی زندگی اور اس سے پیدا شدہ مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان واقعات میں دو باتیں ملتی ہیں۔ایک تو فساد اور دوسرے پناہ گزینوں کی آبادکاری نیز ان کی ضروریات زندگی کا سوال۔اس کے علاوہ سرلا دیوی کے افسانے ان شخصیتوں کے متعلق بھی کچھ کہتے ہیں جو اس وقت عالمگیر انسان دوستی کا دم بھرتے تھے اور جو ملک کو ایک صحت منداشترا کی نظام کی طرف لے جانے کے لیے خفیہ میٹنگ کیا کرتے تھے۔یہ دونوں بڑی تلخ حقیقتیں ہیں۔قرۃ العین حیدر نے بھی اس تلخ حقیقت کو اپنے ادب کا بنیادی محرک قرار دیا ہے۔مگر ان کا انداز بیان اور ان کے واقعات کی پیشکش رومانی ہے۔سرلا دیوی کے واقعات سماجی ہیں لیکن ان میں ایک طرح کی نیم رومانیت آ گئی ہے گرچہ یہ بات ہر افسانے میں نہیں ملتی۔مجموعی طور پر ان کا فن سماجی حقیقت نگاری کا فن ہے،خاص کر ان دنوں سماج میں عورتوں کی جیسی ابتر حالت تھی بالخصوص فساد سے متاثر خواتین کے مسائل کو سرلا دیوی نے اپنے افسانوں میں خاص جگہ دی ہے۔گویا یہ مسائل ان کے بنیادی تخلیقی سروکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی

ا۔ شناخت،ڈاکٹر ش۔اختر،ہمارا پریس رسالدارنگر،رانچی جلد اول 2010،ص 347

۲۔ چاند بجھ گیا،مصنفہ سرلا دیوی،مشمولا ''دیباچہ'' ایشیا پبلشرز، دہلی 1954

۳۔ چاند بجھ گیا،مصنفہ سرلا دیوی،مشمولا ''دیباچہ'' ایشیا پبلشرز،دہلی 1954،ص 97

4۔ کلنک،سرلا دیوی،نو ہند پبلشر لمٹیڈ،عبدالرحمن اسٹریٹ بمبئی، 1869،ص 142، --------1949

5۔ ایضا،ص 141-142

6۔ ایضا،ص 141

ڈاکٹر عزیر احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلام پور کالج، مغربی بنگال
uzair@islampurcollege.ac.in

رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس

Abstract

This paper by Dr. Uzair Ahmad critically examines the scholarly contributions of Professor Rafiuddin Hashmi as a leading contemporary Iqbal scholar. With over forty publications, including twenty-one dedicated to Iqbal studies, Hashmi has established himself as a meticulous researcher with deep insight into global developments in Iqbal criticism. His first book, "Iqbal ki Taweel Nazmein" (1974), and his doctoral thesis under Waheed Qureshi, reflect his commitment to rigorous textual and explanatory analysis. Hashmi's most notable work, "Iqbal: Shakhsiyat aur Fun", addresses the long-felt need for an authentic biography of Iqbal, identifying flaws in existing accounts while offering a reliable alternative. His approach combines scholarly precision with stylistic creativity, evident in the poetic titles of chapters and the inclusion of summaries that enhance readability. Hashmi's writings also challenge misconceptions, such as those surrounding Iqbal's personal life, educational experiences, and ideological positions, providing evidence-based clarifications. By situating Hashmi's work within the broader trajectory of Iqbal studies, this paper underscores his role in shaping modern Iqbaliyat, bridging gaps between traditional scholarship and contemporary critical needs. Dr. Uzair Ahmad highlights Hashmi's unique contribution as both a critic and custodian of Iqbal's intellectual legacy.

Keywords

Dr. Uzair Ahmad, Rafiuddin Hashmi, Iqbal studies, Urdu criticism, biography of Iqbal, Iqbaliyat, textual analysis, literary scholarship, social realism, modern Urdu research

Auther: Dr. Uzair Ahmad, Assistant Prof. Deptt. of Urdu, Islampur College, West Bengal-733202

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا شمار ہم عصر اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ اقبال تنقید کی عالمی پیش رفت پر ان کی گہری نظر ہے۔ یہی ان کا اختصاص ہے۔ آپ کی چالیس سے اوپر تصانیف اردو زبان وادب کے حوالے سے تحقیقی وعلمی سطح پر بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبالیات پر ان کی اکیس (۲۱) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''اقبال کی طویل نظمیں'' (1974ء) ان کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' کے عنوان سے وحید قریشی کی نگرانی میں کیا۔

پورے اقبالیاتی سرمائے پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے اقبالیات میں ہو رہی پیش رفت پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہیں سب سے شدت سے اقبال کی مستند سوانح عمری کی کمی کا احساس ہے۔ انہوں نے ایک سے زائد مضامین میں اس مسئلہ کو اٹھایا لیکن کوئی ایسی سوانح عمری سامنے نہیں آئی جو ان کے معیار پر پوری اترتی اس وجہ سے انہوں نے خود اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی کتاب 'اقبال شخصیت اور فن' اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے لکھی گئی کتاب ہے۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود ایک مستند سوانح ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اس سوانح کو اقبال کی متداول سوانح عمریوں کی خامیوں کی نشاندہی کے لیے لکھا ہے اس وجہ سے انہوں نے متداول سوانح عمریوں کی خامیوں کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھا۔ یہ اس کتاب کی سب اہم خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد اقبال کی سوانح عمریوں میں پائی جانے والی خامیوں کی نشاندہی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس اسلوب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ایک خالی الذہن طالب علم کا ذہن تمام اختلافات سے پاک سوانح عمری کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ جس میں مناظرتی رنگ نہ ہو۔ اس سے کتاب میں جا بجا مناظراتی رنگ کتاب کے تسلسل میں مانع ہوتا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کو بھی اس کا احساس تھا اس وجہ سے انہوں نے ایسے مباحث کو عموماً حواشی میں لکھا ہے تا کہ عام قاری کو ان مباحث سے الجھن نہ ہو۔

رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی سوانح لکھتے ہوئے عناوین شاعرانہ رکھے ہیں۔ مثلاً آبا میرے لاتی ومناتی، وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی، سودائے علم، دیدۂ بینائے قوم، آسودگی نہیں ملتی، شراب علم کی لذت۔۔۔ رفتم بہ تماشائے خرابات فرنگ وغیرہ یہ شاعرانہ عناوین اگرچہ رفیع الدین ہاشمی کے تحقیقی مزاج سے مختلف ہیں لیکن انہیں اس نظر سے دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قلم کا

ذائقہ بدلنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

چوبیس ابواب پر مشتمل اس سوانح عمری کو اس طرح سے مرتب کیا گیا ہے کہ ہر باب کو دوسرے سے مربوط رکھا گیا ہے تا کہ ایک باب پڑھنے کے بعد قاری کا دل دوسرے باب کو پڑھنے کی طرف راغب ہو۔ ہر باب کے شروع میں اس کا خلاصہ ایک ایسی چیز ہے جو تحقیقی کتابوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ اس سوانح میں اقبال کے تعلق سے بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس سلسلے میں خاص توجہ دی ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کی پہلی بیوی اور آفتاب اقبال کی ماں کے حوالے سے 'مظلوم اقبال' جیسی کتابوں کے ذریعہ جس قسم کی فضا تیار کی جارہی ہے اس کا رفیع الدین ہاشمی نے سخت نوٹس لیا ہے۔ انہوں نے دلائل کے ذریعہ الزامات کا رد کیا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے کیمبرج کالج میں تعلیمی دور کی پرلطف مجلسوں کے تعلق سے روایات کے بارے میں بھی تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی راوی عطیہ فیضی ہیں۔ اس وجہ سے عطیہ فیضی کے بیانات کو من وعن قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح صہبا لکھنوی کی اس رائے کی بھی تردید کی ہے کہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف اپنے مشہور مضامین دوسری بار قیام بھوپال کے دوران لکھے۔ انہوں نے لکھا کہ آخری مضمون ISLAM AND AHMADISM کے علاوہ سبھی مضامین دوسری بار جانے سے پہلے لکھ چکے تھے۔

پرفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان واپسی کی تاریخ ۲۳ جولائی کی شب یا ۲۵ جولائی کی صبح قرار دیا ہے۔

علامہ اقبال کے بارے میں تقریباً سبھی سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اقبال کو میٹرک میں کامیابی کی اطلاع بذریعہ تار ۴ مئی کو ملی۔ اس وقت آپ شادی کے گھوڑے پر سوار تھے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس پر سوال کھڑا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تار کس نے بھیجا، اور کہاں سے بھیجا؟

کتاب میں کئی مقامات ایسے بھی آئے ہیں جہاں انہوں نے سید نذیر نیازی کی طرح سوانح اقبال کے بعض خلا کو تخیل کے ذریعہ پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

''تمام طلبہ بشمول محمد اقبال، مارچ ۱۸۹۳ء کے تیسرے ہفتے گجرات پہنچے بہار کے خوش گوار موسم میں گندم کی لہلہاتی فصلوں کے درمیان ریل کا یہ سفر لڑکوں کو اچھا لگا ہوگا۔۔۔ امتحان ختم ہوا اور لڑکے دل و دماغ کا سارا بوجھ اتار چکے تو واپسی کا سفر ان کے لیے بالکل ایک تفریحی ثابت ہوا۔ دلچسپ اور پرلطف۔ ہنستے، مسکراتے، گیت گاتے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتے واپس آئے ہوں گے۔''

اسی طرح یورپ سے واپسی کے بعد ان کی والدہ کے رویہ کو بھی تخیل سے پر کرنے کی کوشش کی ہے۔:

''گھر پہنچتے ہی والدہ نے انہیں لپٹا لیا اور منہ چوما ہوگا۔''

اس قسم کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں لیکن اس کے کتاب کے استناد پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ یہ وہ امور ہیں جو عموماً پیش آتے ہیں۔ اسکول یا کالج کے طلبہ گروپ میں جاتے ہوئے ہنسی مذاق کرتے ہی ہیں۔ گھر واپسی پر ماں اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کا تعلق کسی اہم حقیقت سے نہیں ہے جس کے لیے کسی مآخذ کی ضرورت پڑے۔

ڈاکٹر خالد ندیم کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

'کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد برملا کہا جاسکتا ہے کہ 'عام قاری' کے لیے تحریری کی گئی اقبال کی ی سوانح اپنے مندرجات کی سند محقق کی جستجو اور جہد مسلسل کا احساس دلاتی ہے اور مستقبل کے سوانح نگار کے لے اسلوب اور معیار کی قابل تقلید مثال پیش کرتی ہے۔ غرض یہ کہ استناد واقعات اور اخذ نتائج کے اعتبار سے اس تالیف کو بہت سی علمی کاوشوں پر تفوق حاصل ہے۔

'اقبال کی نثر میں ان کی ولادت سے لے کر بڑھاپے تک کی نادر معلومات ملتی ہیں۔ ان کی صحت اور بیماریوں اور علاج معالجے پر چوں مرگ آید ۲ے کے نام سے جو کتاب دستیاب ہے، وہ بیشتر اقبال کی نثر اور خطوں ہی سے تیار کی گئی ہے۔ اسی طرح حیاتِ اقبال کے دیگر پہلو بھی نثرِ اقبال کے ذریعے سامنے آتے ہیں، مثلاً حصول تعلیم کے لیے انگلستان و جرمنی کا سفر، والدین سے ملاقات کے لیے سیال کوٹ کے سفر، بڑے بھائی شیخ عطاء اللہ سے ملاقات کے لیے ایبٹ آباد، کیمبل پور اور کوئٹے کے سفر، وکالت کے سلسلے میں سری نگر، جھنگ، لکھنؤ اور متعدد دوسرے شہروں کے سفر، گول میز کانفرنسوں میں شرکت اور ضمناً پیرس، ہسپانیہ، روم، مصر اور بیت المقدس کے سفر، افغانستان کا سفر، سرہند شریف کا سفر اور علاج معالجے کے لیے دہلی اور بھوپال کے اسفار کی تفصیلات نثر کی مدد کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتیں۔ نثر میں ہمیں اقبال کے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے وابستگان اور متعلقین (آباء واجداد، والدین، اساتذہ، اعزہ، بیگمات اور بچوں کے حالات) کے بارے میں بھی بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔

بلاشبہہ یہ کتاب اقبال کے سوانحی سرمائے میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اقبال پر سوانحی کتابوں کی جس کم مائیگی کا احساس اپنے مضامین میں کیا تھا اس کتاب کے ذریعہ اس کمی کو انہوں نے پورا کر دیا ہے۔

اقبال کی شاعری اور فن پر رفیع الدین ہاشمی نے اکیس کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں کچھ ان کی اپنی تصانیف ہیں، کچھ مضامین کے مجموعے ہیں۔ زیادہ تر کتابیں اقبالیات پر تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں: ذیل میں ان کی کتابوں کی فہرست اور ان کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

1) اقبال کی طویل نظمیں ۱۹۷۷

یہ اقبالیات پر رفیع الدین ہاشمی کی سب سے پہلی کتاب ہے۔اس میں انہوں نے اپنے ان مضامین کو شامل کیا ہے جو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔اس میں اقبال کی نو طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔اس میں شکوہ جواب شکوہ،شمع وشاعر، والدہ محترمہ کی یاد میں،خضر راہ،طلوع اسلام، ذوق وشوق،مسجد قرطبہ شامل ہیں۔رفیع الدین ہاشمی نے ان میں سے ہر ایک نظم کا فنی اور فکری تجزیہ کرنے کے ساتھ نظم کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو بڑی خوش اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں:

''طالب علمانہ مذاق کی نفاست و پاکیزگی اور محققانہ نظر کی گہرائی اور گیرائی نے اقبال کی طویل نظموں کے اس تجزیے اور تبصرے کو اس عظیم مفکر اور شاعر کے فکر وفن کے سفر کی دل آویز داستان بنا دیا ہے۔'اقبال کی طویل نظمیں' اقبال کی تفہیم وتحسین کے باب میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔''

2) کتب اقبال ۱۹۷۵

اس کتاب میں اقبالیات پر شائع کتابوں اور تراجم کی فہرست ہے۔ یہ اقبالیات پر بلیو گرافی ہے۔اس میں ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۵ تک شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ہے۔

3) خطوط اقبال ۱۹۷۶

اس کتاب میں اقبال کے ایسے ۱۱۱ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔رفیع الدین ہاشمی نے اس میں اقبال کے خطوط ہی کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ اقبال کے پورے مکاتیب پر ایک تنقیدی نوٹ بھی لکھا ہے۔اس سے پیشتر اقبال کے خطوط کو مرتب کرنے والوں سے جو فرگزاشتیں ہوئیں ان کا تعاقب بھی کیا ہے۔ یہ خطوط اردو،عربی، اور انگریزی تینوں زبانوں میں ہیں۔علامہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا واحد عربی خط جو انہوں نے جامع الازہر کے شیخ مصطفی المراغی کے نام لکھا تھا عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے۔خطوط اقبال کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ رفیع الدین ہاشمی نے ہر خط سے پہلے مرسل الیہ کے مختصر

احوال وکوائف کواس کتاب میں درج کر دیا ہے۔

4) اقبال بحیثیت شاعر ۱۹۷۷

رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''اقبال بحیثیت شاعر'' ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اقبال کی شناخت بحیثیت شاعر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، رفیع الدین ہاشمی خود ماہر اقبالیات ہیں۔انہوں نے اس کے اندر مشہور اور مستند ناقدین اقبال کے مضامین کو جگہ دی ہے۔رفیع الدین ہاشمی نے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت سامنے آجائے بلکہ اقبال کے بارے میں ان ناقدین کی رائے اور نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے۔عام طور اقبال ناقدین نے اقبال کے فکر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ایسے میں اقبال کے فن پر یہ مجموعہ اس کمی کی تلافی کی ایک کوشش ہے۔

5) کتابیات اقبال ۱۹۷۷

یہ کتاب اقبالیات پر شائع کتابوں کی فہرست ہے۔اس میں انہوں نے کتابوں کو موضوعات کے حساب سے ترتیب دیا ہے۔ساتھ ہی کتاب کے مشمولات کو بھی پیش کر دیا ہے۔

6) تصانیف اقبال کی تحقیقی وتوضیحی مطالعہ ۱۹۸۲

یہ دراصل رفیع الدین ہاشمی کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۸۱ میں ڈگری تفویض کی گئی۔اس میں انہوں نے اقبال کی اردو فارسی نظموں اور اردو انگریزی اور فارسی کے نثر پر مشتمل علامہ اقبال کی تحریروں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہے۔اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے اقبالیات کے کمالات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس لیے کہ اس میں تمام تصانیف اقبال کا احاطہ کیا گیا ہے اور دنیا کے سب سے بڑے شاعر نیز عصر حاضر کے ایک عظیم ترین مفکر کی ہر قسم کی تحریروں اور تقریروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس سلسلے میں بعض گم شدہ یا غیر معروف چیزوں کی دریافت کے ساتھ ساتھ پیش رو محققین کی متعدد غلطیوں یا غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔''

7) اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے ۱۹۸۵

یہ طلبہ کے لیے لکھی گئی کتاب ہے۔اس کتاب کی ترتیب میں رفیع الدین ہاشمی کے علاوہ خواجہ حمید یزدانی، محمد ریاض اور ڈاکٹر رحیم بخش شاہین بھی شامل ہیں۔کتاب میں اقبال کی تیرہ نظموں کے علاوہ اقبال کی کتابوں میں وارد قصوں کو آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔کل کہانیوں کی تعداد ۳۶۱ ہے۔اور آخر میں جاوید نامہ کی ایک نظم خطاب بہ جاوید کا مفہوم شامل ہے۔

8) ۱۹۸۵ کا اقبالیاتی ادب ۱۹۸۶

رفیع الدین ہاشمی ۱۹۷۳ سے قارئین کے لیے اقبال پر شائع ہونے والی کتابوں کا سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ پیش کرتے رہے ہیں۔رفیع الدین ہاشمی نے اسکتاب میں 1985 میں شائع ہونے والی اقبالیاتی ادب کا جائزہ لیا ہے۔خواہ اس کا تعلق تحقیقی مقالوں سے ہو کتابوں کے متعلق ہو۔یہاں تک مختلف پرچوں میں شائع مضامین کا بھی انہوں نے جائزہ لیا ہے۔اس طرح یہ کتاب ایک طرح سے 1985 کے اقبالیاتی ادب کا مختصر ہی سہی احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔متن اقبال سوانحی کتابیں تشریحات اقبال، فکری وتنقیدی مباحث متفرق مطبوعات، جامعات کے امتحانی مقالے، مجلّات واخبارات کی خصوصی اشاعتیں اور آخری میں کتابیات اقبال جس میں 1985 میں شائع ہونے والے اقبالیات پر مضامین اور کتابوں کی فہرست ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب میں ہر کتاب کو اس کا واجبی حق دیا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔معاصرین اور موجودین کے بارے میں اتنی بے باک رائے دینا رفیع الدین ہاشمی کا ہی حوصلہ ہے۔یقینی طور پر یہ مختصر کتاب اقبالیات پر ایک مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۸۶ کا اقبالیات ادب ایک جائزہ ۱۹۸۸

یہ بھی سابقہ کی کتاب کی طرح ہے۔

9) اقبال شناسی اور محور ۱۹۸۹

''اقبال شناسی اور محور'' ایسی ہی ایک کتاب ہے جس میں رفیع الدین ہاشمی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے علمی وادبی مجلہ

''محور'' کے شماروں میں اقبالیات پر شائع مضامین کو ایک جگہ شائع کر دیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اقبال کا گہرا تعلق رہا ہے، یہیں پر اقبال بی اے عربی کے طالب علم رہے اور بطور ریڈر انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ''محور'' کی خاص بات یہ تھی کہ ابتدا میں اس میں صرف طلبہ کے مضامین ہی شائع ہوا کرتے تھے مگر بعد میں یہ پابندی ہٹالی گئی۔ ''محور'' نے اگرچہ اقبالیات پر کوئی خاص نمبر نہیں شائع کیا مگر اپنے ابتداء (1959) سے لیکر بند ہونے کے سال (1982ء) تک اس مجلہ نے اقبالیات پر گراں قدر تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع کئے۔

زیر نظر کتاب میں سات مضامین ہیں لکھنے والوں میں سید عبداللہ، اسعد گیلانی، رفیع الدین ہاشمی جیسے اہل قلم قابل ذکر ہیں۔ چند مضامین اپنی ندرت اور انداز تحریر کی وجہ سے خاص طور پر قابل توجہ ہیں مثلاً اقبال کے فلسفۂ خودی کا اسلامی پس منظر از شاہدہ ارشد، اقبال اور رجائیت از اختر پرویز، اقبال کے تعلیمی خیالات از سید عبداللہ۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض مضامین اقبالیات کے دوسرے مجموعوں میں مل جائیں مگر کسی ایک مجلہ میں شائع اقبالیات کے مضامین کو یکجا کرنے کی رفیع الدین ہاشمی کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔

10) اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ ۱۹۸۹

یہ کتاب بھی پنجاب یونی ورسٹی کے جرنل آف ریسرچ (فنون) کے ان مضامین کا انتخاب ہے جو اقبالیات پر شائع ہوئے۔

11) اقبالیاتی جائزے ۱۹۹۰

یہ اقبال تنقید کے جائزوں پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں ان میں مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۹۷۵ سے ۱۹۹۰ تک اس موضوع پر لکھے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی نے لکھتے ہیں:

''ان جائزوں اور تبصروں کے مطالعہ کے بعد ایک عام قاری کو اقبالیات پر مختلف جگہوں اور زبانوں میں لکھی جانے والی کتابوں تک بہت جلد آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب کے مطالعے سے اقبالیاتی ادب کی تاریخ کا بیک منظر کا مکمل ادراک حاصل ہوگا۔ اور یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوجائے گی کہ علامہ اقبال پر اب تک کتنا کام ہو چکا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس اس کی ترقی و ترویج کے لیے کیا اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔''

12)علامہ اقبال منتخب کتابیات ۱۹۹۲

یہ کتاب بھی اقبالیات پر شائع کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے۔

13)اقبالیات کے تین سال ۱۹۸۷ تا ۱۹۸۹ (۱۹۹۳)

ان تین سالوں میں اقبالیات پر شائع کتابوں کا جائزہ ہے۔

14)علامہ اقبال اور میر حجاز ۱۹۹۴

اقبال اور عشق رسول پر لکھا گیا ایک کتابچہ ہے جس کو انہوں نے اورینٹل کالج لاہور کی میگزین کے لیے لکھا تھا۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اگر چہ یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اپنے موضوع پر اہم ہے۔

15) تحقیق اقبالیات کے مآخذ ۱۹۹۶

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے میں اقبال پر تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے بنیادی مآخذ کا ذکر ہے۔ اس میں اقبال کی اردو فارسی اور انگریزی سبھی مآخذ کا تفصیلی بیان ہے۔ دوسرے حصے میں علامہ اقبال کی شاعری اور فن شائع اہم کتابوں کا ذکر ہے جن سے طلبہ اور اسکالر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ کتاب ان سبھی لوگوں کے لیے مفید ہے جو اقبالیات پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

16)اقبالیات کے سو سال ۲۰۰۲

پاکستان نے ۲۰۰۲ کو سال اقبال کے طور پر منایا اس موقع پر اکادمی ادبیات پاکستان نے اقبالیات کے سو سال کے نام سے ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ تک شائع ہونے والے اہم مضامین کا انتخاب شائع کرایا۔ اس کے مرتبین میں رفیع الدین ہاشمی کے

علاوہ محمد سہیل عمر اور وحید اختر عشرت بھی تھے۔اس مجموعے کا تعارف کرتے ہوئے مرتین نے لکھا ہے:

''زیر نظر انتخاب میں اقبال کے فکر وفن کے اہم تر موضوعات کا احاطہ کرنے کوشش کی گئی ہے۔ بیشتر صدی کے نمایاں اقبال شناسوں اور نقادوں کی تحریریں ہیں۔ چوں کہ یہ مضامین کسی سکیم یا با قاعدہ منصوبے کے تحت نہیں لکھے یا لکھوائے گئے، اس لیے ان میں کہیں کہیں تکرار کا احساس ہوگا، لیکن اس تکرار میں بھی ایک تنوع موجود ہے۔ بسا اوقات مختلف لکھنے والے، ایک ہی نکتے کی تعبیر وتوضیح اپنے اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اور اپنے اپنے انداز میں کرتے ہیں، (فکری مباحث میں اس کی گنجائش ہوتی ہے، اور جواز بھی) اسی سے تکرار کا جواز نکلتا ہے۔''

اقبالیات کے سو سال' کے نام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اقبالیات پر گذشتہ ایک صدی میں جو کچھ بھی لکھا جا چکا ہے اس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہوگا مگر اس کتاب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے ایک بہترین انتخاب دے دیا گیا ہے اس طرح جہاں ایک طرف ہمیں اقبال فہمی میں مدد ملے دی وہیں مختلف ادوار میں ناقدین نے اقبال کو کس نظر سے دیکھا اور پرکھا اس کی بھی معرفت ہوجائے گی۔ گویا کہ فکر اقبال کے ساتھ یہ کتاب ناقدین کے فکر کا بھی مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔

اقبالیات پر مضامین کے مجموعے تو بہت شائع ہوئے مگر اتنے بڑے پیمانے پر اب تک ناقدین اقبال کے مضامین کا انتخاب شائع نہیں ہوا۔ ایک اچھی بات یہ کہ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کے مضمون نگاروں کے مضامین کو بھی جگہ دی ہے اس طرح یہ انتخاب ملکی سطح سے اٹھ کر عالمی پیمانے پر ہوگیا۔ اس انتخاب میں موجود تقریباً سبھی مضامین معیاری اور معلوماتی ہیں خصوصاً اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے از ممتاز حسن، توازن اقبال کی شاعری کا ایک پہلو از پروفیسر محمد منور، اقبال کا نظریۂ شعر از احمد ندیم قاسمی، کلام اقبال میں خون جگر کی علامتی حیثیت از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، کلام اقبال پر عربی ادب کے اثرات از پروفیسر محمد منور، فلسفہ اقبال کے ماخذ ومصادر از وحید اشرف۔

یہ انتخاب اس معنی میں اہم ہے کہ اس سے اقبال تنقید کی سو سالہ پیش رفت سامنے آجاتی ہے۔ اس میں اقبال کے رفقا کے مضامین کے ساتھ ہم عصر ناقدین اقبال کے مضامین بھی شامل ہیں۔

17) اقبالیات: تفہیم وتجزیہ ۲۰۰۴

یہ کتاب اقبال پر مصنف کے ذریعہ لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں کئی اہم مضامین شامل ہیں جو اقبالیات کی سمت ورفتار کے بھرپور جائزہ پر مشتمل ہیں۔ اقبال صدی پر شائع ہونے والی سوانح عمریوں کا تنقیدی جائزہ، اور اقبال سے منسوب ایک فرضی کتاب تاریخ ہند کی حقیقت ایسے وقیع مضامین ہیں جو اس کی اہمیت وافادیت کو چار چاند لگاتے ہیں۔

18)علامہ اقبال:شخصیت اورفن ۲۰۰۸

اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ اوپر گزر چکا ہے۔

اس طرح علامہ اقبال کی شخصیت شاعری اورفن پر کل ۲۰ کتابیں رفیع الدین ہاشمی نے لکھی ہیں۔اگر اس کے اندر سید عبداللہ کے اقبال پر لکھے گئے مضامین کے مجموعے کو شامل کرلیا جائے جس کو رفیع الدین ہاشمی نے مرتب کیا ہے تو یہ تعداد اکیس تک پہنچ جاتی ہے۔اقبالیات پر اتنی زیادہ اور اہم اور تحقیقی کتابیں لکھنے والے رفیع الدین ہاشمی نے اقبالیات میں اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچادیا ہے جہاں اقبالیات پر کام کرنے والا کوئی بھی شخص ان کو نظر انداز کر کے آگے نہیں جاسکتا۔

رفیع الدین ہاشمی کا مزاج تحقیقی ہے۔اقبال پر لکھی گئی ان کی کتابیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔انہوں نے اس میں اقبال تنقید کی پیش رفت اور کتابیات اقبال کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔ہم نے چوں کہ اقبال کے محققین کا موضوع اپنے مقالے میں نہیں رکھا ہے ان کی تحقیقی کتابوں میں چونکہ سب سے مفصل اور جامع کتاب سوانح اقبال ہے اس وجہ سے ان کو ایک سوانح نگار کے طور پر پیش کررہے ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اقبالیات کے ان گوشوں کو اپنی تحقیق کے لیے چنا جن کی دشواریوں کو دیکھ کر عام طور پر لوگ کتراتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اقبالیات میں انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس نوعیت کی ہیں کہ ان سے ہمیشہ اہل علم اپنی علم کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔

حواشی:

1. اقبال شخصیت اورفن از رفیع الدین ہاشمی ص ۲۳۷
2. ایضاً ص ۹۰
3. ایضاً ص ۳۶
4. ایضاً ص ۳۳
5. ایضاً ص ۸۳
6. اقبالیات اردو،جنوری ۲۰۱۰،ص ۱۴۱

7. رفیع الدین ہاشمی،شرحِ اقبال کا تنوع علامہ اقبال ڈاٹ کام سے ماخوذ
8. مطبوعہ:گلوب پبلی کیشنز، لاہور
9. مطبوعہ: تاج بکڈپو،اردو بازار، لاہور
10. مطبوعہ:خیابان ادب، لاہور
11. یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی۔
12. مطبوعہ:اقبال اکادمی پاکستان
13. ط:اقبال اکادمی پاکستان
14. ڈاکٹرظہوراحمدمخدومی، پروفیسررفیع الدین ہاشمی: حیات اورادبی خدمات،ص ۷۷
15. ط:اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد
16. ط:اقبال اکادمی پاکستان
17. ط۔اقبال اکادمی پاکستان
18. ط:بزم اقبال لاہور
19. ط:بزم اقبال لاہور
20. ط:گلوب پبلی کیشنز، لاہور
21. ظہوراحمدمخدومی،رفیع الدین ہاشمی،حیات اورادبی خدمات ص ۹۱
22. ط:مقتدرہ قومی زبان، پاکستان
23. ط:حرا پبلی کیشنز لاہور
24. ط:بزم اقبال لاہور
25. ط:اقبال اکادمی لاہور
26. ط:اکادمی ادبیات پاکستان
27. مقدمہ اقبالیات کے سو سال

☆☆☆☆

کلیم احمد
ریسرچ اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔110067
موبائل نمبر:8588008236

بلبل دکن: ماہ لقا بائی چندا کی شعری روایت

Abstract

Maah Laqa Bai Chanda (1750–1824), widely celebrated as Bulbul-e-Dakkan, stands as one of the earliest female poets in Urdu literary tradition to compile a complete diwan. Although often portrayed as a court singer and cultural figure in the Asaf Jahi period, her literary contributions reveal a profound blend of feminine sensibility, linguistic refinement, and intellectual depth. Trained under eminent poets such as Sher Muhammad Khan Imaan and Mir Alam, she cultivated a poetic style characterized by simplicity, fluency, and musical cadence. Her diwan, comprising approximately 125 ghazals, reflects both the continuity of the Dakhni tradition and the evolving aesthetics of Urdu poetry in the late eighteenth century. Beyond literature, Maah Laqa's devotion to Muharram rituals, architectural patronage, and cultural engagement underscores her multidimensional identity as poet, mystic, and benefactor. This study situates her oeuvre within the broader trajectory of women's literary voices in Urdu, emphasizing her pioneering role in legitimizing female authorship and shaping the cultural fabric of Hyderabad. By examining her poetic style, courtly affiliations, and socio-religious commitments, the paper highlights Maah Laqa Bai Chanda's enduring legacy as a seminal figure

in Urdu literary and cultural history.

Keywords: Maah Laqa Bai Chanda, Urdu poetry, Dakhni tradition, female poets, diwan, Hyderabad, cultural patronage, Muharram rituals

Author:Kaleem Ahmad

ماہ لقا بائی چندؔا اردو ادب کی اُن نادر شخصیات میں شمار ہوتی ہیں جنہوں نے نسوانی شعری روایت کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ عملی طور پر صاحبِ دیوان شاعرہ کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ اگرچہ تاریخ میں انہیں عموماً ایک مغنیہ اور درباری فنکارہ کے طور پر پیش کیا گیا، تاہم ان کی شاعری، علمی تربیت، درباری وابستگی اور مذہبی وثقافتی خدمات انہیں ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت بناتی ہیں۔ کیونکہ اردو شاعری کی تاریخ میں خواتین شاعرات کی تعداد کم ہی ہے اور صاحبِ دیوان شاعرہ ہونا ایک غیر معمولی امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ ایسے میں ماہ لقا بائی چندؔا کا ظہور نہ صرف دکنی ادب بلکہ مجموعی اردو شعری روایت میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی شاعری، موسیقی، درباری مقام اور ثقافتی خدمات کے باعث ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔

ماہ لقا بائی چندؔا کی تاریخِ پیدائش کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم تحقیقی شواہد کے مطابق ان کی درست تاریخِ پیدائش 20 ذی قعدہ 1181ھ تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کا اصل نام چندا بی بی تھا، جبکہ ''ماہ لقا'' خطاب کے طور پر معروف ہوئیں اور شاعری میں چندؔا تخلص اختیار کیا۔ ان کے والد بہادر خان اور دادا مرزا سلطان نظر تھے، جنہیں شاہ عالم کے دور میں بسالت خان کا خطاب ملا۔ اس طرح چندؔا ایک معزز اور باوقار خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی والدہ راج کنور بائی گجرات سے تعلق رکھتی تھیں اور ایک مالدار خاندان کی فرد تھیں، جس کا اثر ماہ لقا کی پرورش اور تربیت میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

ماہ لقا چندؔا کی ابتدائی تعلیم سلطنتِ آصفیہ میں رکن الدولہ مدار المہام کی سرپرستی میں ہوئی۔ انہوں نے مروجہ علوم میں مہارت حاصل کی اور اردو، فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی قابلِ ذکر عبور حاصل کیا۔ یہی علمی پس منظر ان کی شاعری میں فکری توازن اور اسلوبی سادگی کا سبب بنا۔ شاعری کے میدان میں انہوں نے شیر محمد خان ایمانؔ سے باقاعدہ تلمذ اختیار کیا، جبکہ میر عالم جیسے قادر الکلام شاعر سے مشورۂ سخن بھی کرتی رہیں۔ اس ادبی تربیت نے ان کے کلام میں اعتماد، بانکپن اور فنی پختگی پیدا کی۔

ماہ لقا کا دور وہ دور ہے جب شمال میں میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ جیسے اساتذۂ سخن اردو کی تعمیر میں مصروف تھے۔ جنوب میں شیر محمد خان ایمانؔ، چندو لال شادؔاں اور محمد صدیق قیس جیسے مسلم الثبوت اساتذہ گیسوئے اردو کو سنوارنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس طرح ماہ لقا چندؔا اردو کے ان بزرگ اساتذہ کی ہمعصر تھی۔ اس وقت حیدرآباد میں دو ایسے اساتذۂ سخن موجود تھے جو میرؔ اور سوداؔ کے شاگرد تھے۔ میر ذوالفقار علی خاں صفاؔ، میرؔ کے شاگرد تھے اور مرزا علی لطف، سوداؔ کے شاگرد تھے۔ اس دور میں ارسطو جاہ کے حکم سے چندؔا نے (32) سال کی عمر میں 1213ھ میں اپنا دیوان بھی مرتب کر لیا

تھا۔(دکن میں اردو مع اضافہ آندھرا پردیش میں اردو،نصیر الدین ہاشمی،ص،529)اسی طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس دیوان کے بارے میں''داستان ادب حیدرآباد''میں لکھا ہے کہ:

> ''چندؔا نے اپنی وفات سے 14 سال قبل 1226ھ میں خود اپنا دیوان مرتب کیا تھا جس میں ایک سوپچیس(125)غزلیں ہیں اور ہر غزل پانچ شعر کی ہے۔''(داستان ادب حیدرآباد،محی الدین قادری زور،ص،153)

ماہ لقا کے دیوان کے جتنے نسخے ملے ہیں ان میں کسی میں (137) غزلیں اور کسی میں (98) غزلیں اور کسی میں (125) غزلیں ہیں۔ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی کتاب''مہ لقا''کے آخر میں جو دیوان ہے اس میں بھی ایک سوپچیس غزلیں ہیں انہوں نے آخر میں کسی مخطوطہ سے ایک اور غزل تلاش کر کے(۱۲۶)غزلیں کر دی ہیں۔

میرؔ کا انتقال 1225ھ میں ہوا۔اس وقت ماہ لقا 44 سال کی تھیں اردو زبان کا یہ وہ دور تھا جب وہ ارتقائی منازل طے کر رہی تھی ایسے دور میں ماہ لقا نے ایسی زبان اور ایسے لب ولہجہ میں شاعری کی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اس کی شاعری کی بہت سی خصوصیتیں منفرد حیثیت رکھتی ہیں ایک تو زبان کی سلاست،شیرینی وشگفتگی اور دوسری منفرد خصوصیت ان کی نسائیت ہے۔ چندؔا نے لاکھ مردانہ لب ولہجہ میں بات کی ہو لیکن نسائیت کی نغمگی ہر مقام پر نمایاں ہے اور پھر مقطع پر پہنچ کر اپنے کو ظاہر کر ہی دیتی ہیں غالباً خواتین شاعرات میں یہ دوسری شاعرہ ہیں جنھوں نے نسوانی لب ولہجہ میں شاعری کی اور اس صنف کی نمائندگی بھی کی۔

ماہ لقا چندؔا تین اہم درباروں سے وابستہ رہیں(1)ارسطو جاہ(2)میر عالم(3)اور چندو لال شاداں۔ان درباروں میں ان کی حیثیت محض ایک مغنیہ کی نہ تھی بلکہ ایک معزز ادبی وثقافتی شخصیت کی تھی۔موسیقی میں مہارت کے ساتھ ساتھ شاعری میں ان کا بلند مرتبہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فطری طور پر ایک مکمل فنکارہ تھیں۔اگر چہ شعر کہنا ان کے لیے تفریحِ طبع کا ذریعہ تھا، تاہم ان کے کلام میں سادگی،سلاست اور روانی نمایاں خصوصیات کے طور پر جلوہ گر ہیں۔ایمانؔ کی شاگردی کے اثرات ان کے کلام میں اعتماد اور دکنی روایت کے تسلسل کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

قطب شاہی عہد سے حیدرآباد دکن میں ماہِ محرم کے سلسلے میں عزاداری اور استقبالِ محرم کی جو رسوم وروایات قائم ہوئیں، وہ مختلف تاریخی نشیب وفراز کے باوجود آج بھی پورے آب وتاب کے ساتھ جاری ہیں۔ان روایات میں سیاہ پوشی،ترکِ لذتِ طعام،جلوسِ علم بی بی اور دیگر علامتی مظاہر کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔محرم کے موقع پر عاشور خانے سجائے جاتے ہیں،روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے،مرثیہ خوان،سوز خوان اور ماتمی گروہ مرثیے،سوز وسلام اور نوحے پیش کرتے ہیں۔اس عمل میں صرف روایت کی پاسداری ہی نہیں کی جاتی بلکہ نئی طرزیں،نئے لحن اور نئی صوتی جہتیں بھی تخلیق کی جاتی ہیں،جن کی باقاعدہ مشق محرم سے قبل اور اس کے دوران جاری رہتی ہے۔اس طرح عزاداری محض مذہبی عمل نہیں بلکہ ایک زندہ ثقافتی اور فنی روایت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ماہ لقا بائی چندؔا نے اس عزاداری کی روایت کو نہایت عقیدت،وقار اور شان کے ساتھ اپنایا۔محرم کے مہینے میں

وہ لذیذ غذا ترک کر دیتی تھیں اور ہر عاشور خانے کو نذرانے پیش کرتیں، جو ان کے مذہبی شعور اور سماجی ذمہ داری کا مظہر ہے۔ ان کا محل ایلچی بیگ کی کمان میں واقع تھا، جو اپنے حسنِ تعمیر، سقف ولنگر اور نفیس وشاندار آرائش کے باعث نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ محل کے سامنے ایک مستقل عاشور خانہ تعمیر کیا گیا تھا، جبکہ اس کے مقابل نقار خانہ قائم تھا۔ عاشور خانے میں سیاہ مخمل کا فرش بچھایا جاتا تھا، جو سوگ اور احترام کی علامت تھا۔ ماہ لقا چندؔا کو عمارتوں کی تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس ذوق کا واضح ثبوت کوہِ مولا علی پر اپنی والدہ کے مقبرے کی تعمیر ہے جس پر انہوں نے تقریباً ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم صرف کی۔ (رثائی شاعری اور خواتین حیدر آباد، ریاض فاطمہ، ص،50) یہ اقدام نہ صرف ان کے جمالیاتی شعور کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ماہ لقا چندؔا مذہبی عقیدت، ثقافتی روایت اور سماجی وقار کو عملی سطح پر یکجا کرنے والی ایک نمایاں شخصیت تھیں۔

چندؔا صاحب منصب جاگیر تھیں۔ عشق اہلِ بیت رسول کی دولت سے مالا مال بھی تھیں یہی وجہ ہے کہ آج تک حیدر آباد میں انِ کی یادگاریں موجود ہیں۔ جن میں حیدر گوڑہ (اولڈ ایم۔ ایل۔ اے۔ کوارٹر) پیلے پہاڑ، علی باغ اڈیکمیٹ (عثمانیہ یونیورسٹی) شامل ہیں۔ ان کی زندگی کے شب وروز کے معمولات کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ نماز فجر کے بعد وظائف میں مشغول ہوجاتیں، صحیفہ کاملہ جناب سید الساجدین امام علی العابدین پڑھ کر طلوع آفتاب تک اپنے دل کو جناب کبریا کی طرف رجوع کرتیں بعد ازاں کلام مجید کی تلاوت ببر علی مشہور بہ لاڈلے صاحب سے کرتیں۔

تذکرہ جاتی مصادر میں ماہ لقا بائی چندؔا کے روزمرہ معمولات، شاعری اور موسیقی سے گہری وابستگی کا واضح ذکر ملتا ہے۔ وہ خوش گلو تھیں اور فنِ موسیقی کی باضابطہ تعلیم یافتہ بھی، نیز ان کے محل میں عاشور خانے کی موجودگی ان کی عزاداری سے وابستگی کی دلیل ہے۔ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے حضرت علیؑ سے ان کی عقیدت اور اہتمامِ عزاداری کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ کسی معتبر تذکرے میں ماہ لقا چندؔا کے تحریر کردہ سلام، مرثیے یا نوحے کے کہنے یا پڑھنے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ خلا اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ ان کے مذہبی کلام یا تو محفوظ نہ رہے یا تذکرہ نگاروں کی توجہ غزلیہ شاعری تک محدود رہی، جو آئندہ تحقیق کا ایک اہم پہلو ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین اپنی کتاب ''حیدر آباد میں اردو کا نسائی ادب'' میں چندؔا کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''چندؔا کے دیوان میں اس کی غزل کے مقطع، اس کے عشق محمد وآل محمد کے گواہ ہیں۔ چندؔا کو اپنے ممدوحین سے اپنے قلبی لگاؤ اور عشق ومحبت پر کامل یقین تھا۔ جس کی بناء پر وہ حضرت علی مشکل کشا سے یہ آس وامید رکھتی ہے کہ قیامت میں بخش دی جائے گی۔'' (حیدر آباد میں اردو کا نسائی ادب، ڈاکٹر آمنہ تحسین، ص،216)

اس کے دیوان میں موجود غزل کے مقطعے جو اس کے جوش عقیدت اور عشق محمد وآل محمد کے گواہ ہیں۔ چندؔا کو خود اپنی عقیدت اور عشق پر بھروسہ تھا چنانچہ وہ مولا علی سے یہ امید رکھتی ہیں کہ قیامت میں بخشش دی جائیں۔ اپنی زندگی میں انھوں نے کس طرح سے آل عباس اور حیدر کرار کو مدد کے لئے آواز دی ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

یا علی خط کو کنیزی ہے جو چندؔا نے لکھا
ہوے زوار نجف ہے یہ نمایاں کاغذ

چندؔا اپنے رتبہ کی بلندی وافتخاری کی تمنا اس طرح کرتی ہے۔

چندؔا کو بخش یاعلی اپنی جناب سے
رتبہ جو دو جہان میں ہو افتخار کا

یا علی کیجئے فردوس میں چندؔا کو عطا
لعل کا قصر کہ ہووے جسے باب یاقوت

بجز حق کے کوئی کب واصف وصف ائمہ ہو
رہا چندؔا فلک پر بھی یہی نکتہ نہاں گویا

یہ بات مسلم ہے کہ قدرت کی عنایات جب کسی فرد پر ہوتی ہیں تو وہ مختلف جہات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ماہ لقا بائی چندؔا انہیں خوش نصیب شخصیات میں شمار ہوتی ہیں جن پر قدرت کی نوازشیں بے دریغ رہیں۔ وہ دنیوی اور اخروی دونوں طرح کی آسودگی کی خواہاں تھیں، جس کے حصول کے لیے انہوں نے خلوصِ عقیدت کے ساتھ حضرت علیؑ کو وسیلہ بنایا۔ اعتقادی اعتبار سے ماہ لقا چندؔا شیعہ اثنا عشری تھیں، جس عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ نجات اور شفاعت کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے گہری عقیدت کے باعث ماہ لقا چندؔا نے دنیاوی آلام ومصائب میں مدد اور آخرت میں نجات کی امید انہیں سے اور اولادِ علیؑ سے وابستہ رکھی۔ اس طرح ان کی عقیدت محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک منظم اعتقادی تصور کے تحت استوار نظر آتی ہے۔

دیکھ چندؔا کو یہ کہتے ہیں مولی علی
حیدرآباد میں اک اہل وفا رہتا ہے

نہ چندؔا کو طمع جنت کی نہ خوف جہنم ہے
رکھے ہے دو جہاں میں حیدرکرار سے مطلب

چندؔا نے اپنی زندگی میں کس طرح حیدرِ کرار اور آلِ عباس کو اپنی مدد کے لیے پکارا ہے ان اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

نہ ہو چندؔا زمانے میں کسی سے ملتجی ہرگز

جو کہنا ہے تجھے کہہ شبر و شبیر سے اپنے

کرو مشکل کشا مشکل کشائی جلد چندآ کی
نکلتا منہ سے ہر دم ہے یہی بے اختیاری میں

چندآ کی ہے یہ عرض کہ دونوں جہان میں
اپنی طرف ہی رکھیو مرا بوتراب دل

ماہ لقا بائی چندآ کے مقطعوں میں ان کے باطنی احساسات اور فکری جہات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں، جن سے ان کے کردار اور ذہنی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے کلام کی یہی صوری خصوصیات ان کی شعری انفرادیت کو متعین کرتی ہیں۔ اگرچہ ماہ لقا چندآ کا دیوان محض 629 اشعار پر مشتمل ہے اور کمیت کے اعتبار سے مختصر محسوس ہوتا ہے، تاہم کیفیت کے لحاظ سے یہ نہایت وقیع اور قابلِ توجہ ہے۔ اس مختصر مجموعے میں وہ تمام اوصاف ملتے ہیں جن کی توقع عام طور پر ایک استادِ سخن کے دیوان سے کی جاتی ہے۔ اگرچہ ماہ لقا کو رسمی طور پر استادِ سخن کا درجہ حاصل نہ تھا، لیکن ان کا کلام اس معیار کا ہے کہ اسے بلا تامل اساتذۂ سخن کے کلام کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے اور اسے کسی متوسط درجے کی شاعرہ کی تخلیق سمجھنا ممکن نہیں۔

ماہ لقا کو بلند پایہ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور عالموں کی صحبت ملی تھی ساتھ ہی وہ اپنا کافی وقت بلند مرتبہ مصنفین و مؤلفین کی تخلیقات سے استفادہ کرنے میں گزارتی تھیں۔ اس علمی ماحول نے ان کے افکار کو بلند سے بلند تر کرنے میں بڑی مدد کی۔ وہ فطری شاعرہ تھیں۔ غالباً انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس دور کے مسلم الثبوت استاد شیر محمد خان ایمانؔ کو اپنا کلام دکھاتی تھیں، لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے کہ وہ موسیقی کے نکات کو سمجھنے کے لئے استاد موسیقی خوشحال انوپ سے گفتگو کیا کرتی تھیں اور پھر ان کی زبان کی بے ساختگی سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ جو کچھ کہتی تھیں سوچ سمجھ کر کہتی تھی اور شعر میں وہ زبان استعمال کرتیں جیسے گفتگو کر رہی ہوں۔

غمزہ و ناز و ادا، شیوہ ہے خوبوں کا مگر ہر سخن پہ روٹھ جانا کون سا دستور ہے
خورشید رو قسم ہے یہ زلفوں کی تو نے کل وعدہ کیا تھا دن کا مگر رات ہو گئی
گر میرے دل کو چرایا نہیں تو نے ظالم کھول دے بند ہتھیلی کو بتا ہاتھوں کو

ماہ لقا نے جن محاوروں کا استعمال کیا ہے وہ کم وبیش وہی محاورے ہیں جو خواتین استعمال کرتی ہیں۔ بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مردانہ ضمائر کے ساتھ لب ولہجہ کو مردانہ رکھنا چاہتیں ہیں لیکن جب محاوروں کو برتتی ہیں تو بڑی بے ساختگی کے

ساتھ انہیں کو سلک شعر میں پروتی ہیں جو عورتوں کی زباں کے ترجمان ہوتے ہیں۔

ہم جو شب کو ناگہاں اس شوخ کے پالے پڑے
دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے

کہاں سمجھائے سے سمجھے ہے ناداں قدر تو دل کی
نہ تو جب تک پڑے ظالم کسی بے درد کے پالے

ماہ لقا نے جہاں سادہ و سلیس زبان میں شاعری کی ہے وہیں بعض صنعتوں کے ساتھ اچھوتی تشبیہوں سے اپنے کلام کو آراستہ بھی کیا ہے۔صنعت حسن تعلیل اور بعض تشبیہیں دیکھئے۔

جو دیکھا یار کے عارض پر میں نے تعال تاباں کو
کہی پھبتی کہ یہ ہندو کرے ہے حفظ قرآن کو

کچھ کچھ نظر جو آتی ہے سیماب میں تڑپ
سیکھی ہے طرز دل سے میرے اضطرار کی

ماہ لقا جب تصوف پر غور کرتی ہیں تو ان کی بصیرت انھیں مناظر الٰہیہ سے روشناس کراتی ہیں۔

ہماری چشم نے ایسا کمال پایا ہے
جدھر کو دیکھیے آتا ہے تو نظر ہم کو
ادا شرط عبادت ہو سکے ہے کب بھلا اس کی
خودی کو اپنی جب بھولے خدا کی یاد تک پہنچے

عشق کے تعلق سے ماہ لقا کے خیالات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس پاکیزہ جذبہ کو وہ کس قدر بلند مرتبہ والا جذبہ سمجھتی ہیں۔

ہر چند راہ عشق میں دل پائمال ہے
روز جزا میں رتبہ ہے اس انکسار کا

ماہ لقا چندا اخلاق کے اعلیٰ اقدار انسان دوستی و محبت کو نہایت دلنشیں پیرائے میں بیان کرتی ہیں یہاں ان کے افکار و اعمال باہم متحد ہیں۔دردمند دل کسی کے غم کو دیکھ نہیں سکتا۔اشعار دیکھیں:

بجز حق کے نہیں ہے غیر سے ہرگز توقع کچھ

مگر دنیا کے لوگوں میں مجھے ہے پیار سے مطلب

ماہ لقا چندا کے یہاں محاکاتی اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ متحرک نظر آتے ہیں۔

باہر جو نکلے برقعے سے وہ روئے آتشیں
چادر میں ابر کی وہیں منھ کو چھپائے برق

انھوں نے جس خیال کو بھی پیش کیا ہے اس میں ایک ندرت رکھی ہے۔

گویا کہ تازہ کفر کی وہ ابتدا کرے
دل کو جو ان بتوں سے کوئی آشنا کرے

یہ تو ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ چندا نے محمد قلی قطب شاہ کا دیوان دیکھا ہو کیونکہ ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے۔لیکن جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ عظیم ذہن، زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کی فکر میں ایک طرح کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے محمد قلی قطب شاہ نے جس طرح یہاں کے موسموں پر نظمیں کہی ہیں۔ چندا نے بھی اسی طرح بسنت پر نظم کہی ہے۔ راگ بسنت میں اپنے دھر وپد بھی بنائے ہیں اسی طرح بہار پر بھی ان کی ایک نظم ہے۔

بس ہجوم گل سے اپنے کیا خوش آتی ہے بسنت
باغ میں گلرو کے آگے رنگ لاتی ہے بسنت
جلوہ گر ہو یار جب بر میں لئے رنگیں قبا
جس طرف کیجئے نظر دھومیں مچاتی ہے بسنت

ماہ لقا کے حقیقی حالات، فطری جذبات اور ذاتی تاثرات بہت صاف ستھرے اور بہت بلند ہیں لیکن ان کی شاعری میں کچھ ایسے پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن کو دیکھ کر یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ بعض مقامات پر وہ بہت زیادہ شوخ ہو جاتیں ہیں۔جس پر بعض ذہن مبتذل انداز میں سوچنے لگتے ہیں۔ چند غزلوں میں یہ شوخی حد اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے اور عریانیت نظر آنے لگتی ہے۔حالانکہ ان کی یہ شوخی ایک طرح سے دکھاوے کی ہے۔ایسی معاملہ بندی تو کم وبیش ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔راحت عزمی لکھتے ہیں:

''ماہ لقا دکن کی بہت ہی متمول فنکار خاتون تھی۔شخصیت بھی باغ و بہار تھی۔شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ حاضر جوابی میں اس کا جواب نہ تھا اس کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتی تھی۔وہ رقص وموسیقی میں کامل الفن تھی۔اس کی یہی فطری صلاحیتیں اور اس کا فن اس کی معاش کا ذریعہ تھے۔اس کے تمول میں انہی کی برکت اور مربیوں کے بذل وعطا کی کارفرمائی ہے۔''(ماہ لقا (حالات زندگی مع دیوان)، راحت عزمی، ص، 57)

ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ماہ لقا بڑی موسیقار تھیں۔ساتھ ہی وہ شاعرہ بھی تھیں۔اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک ماہر رقاصہ بھی تھیں۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بزم موسیقی میں اساتذۂ فن مختلف راگ راگنیوں سے جہاں محفل کو گرماتے ہیں وہاں تبدیل ذائقہ کے لئے ہلکی موسیقی کا ایک گوشہ بھی رکھتے ہیں۔ٹھمری، داور اور غزل گا کر ساری محفل کے ذوق کی تکمیل کر دیتے ہیں۔رقص کے تقاضہ کے اعتبار سے عین ممکن ہے کہ ماہ لقا چندا کسی اور کی غزل گانے کے بجائے خود ایسے چار شعر موزوں کر لیا کرتی ہوں گی کیونکہ وہ ایک بزم شناس خاتون تھیں۔رنگ محفل کو سمجھتی تھیں،ان کے بلند خیالات کے مقابلہ میں چند ہی غزلوں میں ان کے شوخی وعریانیت کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔

گو اختراع عیش کا معدن ہے تو مگر
رغبت مجھے ہمیشہ ہے بوس و کنار سے

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے
جی میں ہے کیجئے پیار سے بوس و کنار خوب

مندرجہ بالا اشعار کے مقابلہ میں معاملات عشق کے تعلق سے ان اشعار کو دیکھئے جذبہ کی سچائی کتنی روشن ہے۔

گر دام سے اپنے ہمیں آزاد کروگے
پھر کس سے یہ کنج قفس آباد کروگے
اوروں سے اگر دوستی رکھتے ہو بظاہر
باطن میں یقیں ہے کہ ہمیں یاد کروگے

ماہ لقا کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بھرپور موسیقیت ہے انھوں نے انہیں بحروں میں شعر کہے ہیں جن کے اوزان میں نغمگی ہے ان کا یہ عمل فطری ہے۔موسیقی کے ماہرین کو ہمیشہ اس عالم میں دیکھا گیا ہے کہ وہ سر اور تال میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں ہمیشہ گنگناتے،کسی نہ کسی راگ کی تانیں کسی کی سرگم بناتے رہتے ہیں۔ماہ لقا بھی موسیقار تھیں سر اور تال ان کی رگ وپے میں سرایت کر گئے تھے۔گنگنانے کے دوران اگر کوئی مصرعہ موزوں ہو جاتا ہوگا تو وہ اس پر غزل مکمل کر لیتی ہوں گی۔کیونکہ وہ شعر اسی وقت کہتی تھیں جب طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہو۔یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان بہت مختصر ہے۔جو مجموعۂ کلام 32 سال کی عمر میں مرتب ہوا تھا بس وہی دیوان ہے۔اس دیوان کے مرتب ہونے کے بعد بھی وہ 27 سال زندہ رہیں لیکن دیوان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کو اپنے اوپر وارد نہیں کیا تھا۔لیکن انھوں نے جتنا بھی کہا خوب کہا ہے۔ان کے کلام میں رقص وموسیقی کے اظہار بھی موجود ہیں۔

نغمۂ سوز سے دل کیونکر نہ پرواز کرے

رقص کرتا ہے تو جس وقت بجا ہاتھوں کو

ایک غزل کی ردیف ہی رقص ہے۔

دور شراب سرخ ہے یاں صبح و شام رقص
دیکھے کبھی تو یار یہ مجلس تمام رقص
گر چھوڑ بزم غیر کو آجائے یاں تلک
دکھلا دو مجھ کو ایسا ہی جس کا ہے نام رقص

ماہ لقا چندؔا کے کلام میں ندرت، سلاست، روانی، تازگی، شگفتگی، شیرینی، نغمگی، سادگی اور صفائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی کسی غزل کو پڑھیے آمد ہی آمد نظر آئے گی، آورد کا احساس کہیں نہیں ہوگا۔

گل کے ہونے کی توقع میں جئے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لئے بیٹھی ہے

مشک سے مطلب نہیں اس کو نہ عنبر سے غرض
ہے جسے صبح و مسا گیسوئے دلبر سے غرض

میر تقی میرؔ اور شیر محمد خاں ایمانؔ کی ہم عصر ہونے کے سبب ماہ لقا چندؔا نے وہی زبان اختیار کی جو اساتذۂ سخن کی روایت میں مستعمل تھی۔ وہ لفظوں کے مزاج اور محاوراتی امکانات سے بخوبی واقف تھیں اور اپنے اظہار کے لیے ایسے الفاظ وتراکیب کا انتخاب کرتی تھیں جو دوام اور معنوی استحکام رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں متروک الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں، جس کے باعث ان کا ہر شعر دو صدیوں بعد بھی تازگی اور شگفتگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس اعتبار سے ماہ لقا چندؔا نے اردو زبان وشاعری کی تشکیل و تہذیب میں اساتذۂ سخن کے شانہ بہ شانہ حصہ لیا۔ اگرچہ انہوں نے کم کہا، مگر فنی اعتبار سے معیاری اور پائیدار شاعری کی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعرات کی ادبی تاریخ مرتب کرتے وقت ماہ لقا چندؔا کا نام ان کی سادہ، سلیس اور دیرپا زبان کے سبب نمایاں حیثیت اختیار کرے گا۔

مراجع ومصادر:

1) گلزار ماہ لقا، ماہ لقا چندا، نظام المطابع، حیدرآباد، دکن، سن اشاعت، 1906ء
2) دیوان مہ لقا بائی چندا، ماہ لقا چندا، مرتبہ: شفقت رضوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، اشاعت اول۔

3) مہ لقا(مہ لقا بائی چندا کی زندگی اور اس کا کلام)مرتبہ:ثمینہ شوکت ایم۔اے۔نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد،دکن،سن اشاعت،1959ء

4) ماہ لقا(حالات زندگی مع دیوان)،راحت عزمی،بزم گلستان اردو،سن اشاعت،1998ء

5) حیات ماہ لقا چندا،انجمن ترقی اردو ہند،

(Rekhta.org/ebooks/detail/hayate-mah-leqa-chanda-ebooks)

6) سخنوران حیدرآباد(حیدر آباد میں اردو شاعری آزادی کے بعد)،ڈاکٹر سید بشیر احمد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤ، دہلی،2007ء

7) دکن دیس کی پیش روغزلیں،اسلم مرزا،الانصار پبلیکیشنز،حیدرآباد،2016ء

8) رثائی شاعری اورخواتین حیدرآباد،ریاض فاطمہ،بوستان اشہر پبلیکیشنز،پرانی حویلی،حیدرآباد،سن اشاعت،2008ء

9) حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب،ڈاکٹر آمنہ تحسین،روشان پرنٹرس،دہلی۔6،سن اشاعت2016ء

10) دکن میں اردو مع اضافہ آندھرا پردیش میں اردو،نصیر الدین ہاشمی،نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،سن اشاعت،1963ء

11) داستان ادب حیدرآباد،محی الدین قادری زور،ادارہ ادبیات اردو،شمارہ 163،گولڈن جبلی ایڈیشن،سن اشاعت،1982ء

*****

عائشہ
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو
ویر بہادر سنگھ پوروانچل یونیورسٹی، جونپور، یوپی
aishamanzoor0786@gmail.com

مولانا ظفر علی خاں: ایک تحقیقی جائزہ

Abstract

Maulana Zafar Ali Khan (1870–1959) occupies a pivotal position in the intellectual and literary history of Urdu. Born in Sialkot, his early education and formative years at Aligarh Muslim University shaped his literary sensibilities and political consciousness. His association with eminent scholars such as Shibli Nomani and Nawab Mohsin-ul-Mulk further refined his intellectual outlook. Zafar Ali Khan's contributions span multiple domains: poetry, translation, journalism, and political activism. His translations of scientific and philosophical works, including The Conflict of Religion and Science and Persia of Garden, introduced modern thought to Urdu readership. As a poet, his verses combined classical aesthetics with nationalist fervor, while his journalistic endeavors—particularly through the newspaper Zamindar—gave voice to anti-colonial resistance and Muslim identity. His literary and political career reflects the dynamic interplay between tradition and modernity, faith and reform, and art and activism. This study critically examines Zafar Ali Khan's multifaceted contributions, situating him as a bridge between Aligarh's reformist legacy and the nationalist movements of early twentieth-century India. His role as poet, translator, and activist underscores his enduring significance in shaping Urdu literature and socio-political discourse.

Keywords: Maulana Zafar Ali Khan, Urdu literature, Aligarh movement, translation, journalism, nationalism, Zamindar, reformist thought

Author: Aaisha

Department of Urdu

Veer Bahadur Singh Purvanchal University

Jaunpur (U.P)

Email: aishamanzoor0786@gmail.com

مولانا ظفر علی خاں سیالکوٹ میں ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے، یہ اپنے والد مولوی سراج الدین احمد صاحب کے سب سے بڑے فرزند تھے اس لیے گھر والوں نے شکریہ کے طور پر انکا نام ''خداداد'' رکھا، اور ان کے دادا مولوی کرم الٰہی نے ان کا تاریخی نام ظفر علی منتخب کیا۔

ان کی ابتدائی تعلیم مشن اسکول وزیر آباد سے ہوئی، اس کے بعد پٹیالا سے میٹرک کیا، وہاں وہ اپنے پھوپھا کے پاس رہتے تھے، مولانا کے والد محترم مولوی سراج الدین کشمیر کے محکمہ ڈاک میں افسر تھے، اپنے والد کے بلانے پر مولانا نے شری نگر میں آکر محکمہ ڈاک میں ملازمت اختیار کر لی۔ پر ں۔شمس الدین جو یہاں کے دفتر کے ہیڈ کلرک تھے، ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو یہ ان سے ناراض ہو کر ہجو لکھ ڈالی اور ملازمت چھوڑ علی گڑھ آ گئے۔

۱۸۹۴ء میں انہوں نے علی گڑھ سے بی اے فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا، علی گڑھ کے اچھے ماحول نے اور بی اے کی چار سال کی مدت یہ وہ اہم ترین زمانے ہے جس نے انھیں علی گڑھ کے ممتاز ترین طلبہ کی صف میں شامل کر دیا۔

علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا نے ظفر علی خان کی صلاحیتوں کو اور نکھارا جس کی وجہ سے ان کی فکری استعداد مکمل طور پر سامنے آ گئی، انھوں نے کالج میں متعدد علمی و ادبی مقالات پیش کیے، نظمیں پیش کیں اور کالج میں اپنی تحریر و تقریر کی بدولت ممتاز طلباء میں شامل ہو گئے۔علامہ شبلی نعمانی کو خطاب ملنے پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مولانا نے ممدوح کی شان میں منظوم قصیدہ کہا، سید سلیمان ندوی نے جس کی بہت زیادہ تعریف کی۔ایک دفعہ کا ذکر ہے، اسٹریچی ہال میں ایک بہت بڑے جلسے کا انعقاد کیا گیا اس میں مشہور مہمانوں کو مدعو کیا گیا، اس میں سرسید کی شان میں ظفر علی خان نے ایک فارسی نظم پڑھی۔

مسخر کرد نطق کشور جادو بیانی را
بہ رام آورد طبع صدر وحشی و معانی را
بی آن سید احمد ہم نشیں محکم

کہ ماہر است یکسر چارہ درد زمانی را
ریاض قوم آب از اشک ہای چشم او گوہر
فلک چشم تو گاہے دیدہ است این باغبان

اس نظم پر واہ واہ کے شور سے پورا ہال گونج اٹھا، سرسید ان سے اتنا زیادہ متاثر ہو گئے کہ انہیں اپنے گلے سے لگا لیا، اور پھر اسٹیج پر کھڑا کر دیا۔ ان کی قابلیت کے جوہر تو دوران تقریر ہی نکھر کر سامنے آ گئے تھے، اسی زمانے میں علی گڑھ میں فراغت کے بعد نواب محسن الملک کی انتخاب نظر نے ظفر علی خان کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنا لیا، مولانا صحیح معنوں میں نواب کے ایک اچھے جانشین ثابت ہوئے۔ مولانا اس زمانے میں نواب صاحب کی انگریزی خط و کتابت کے علاوہ ان کے حسب الحکم فلسفہ کے مضامین اور دوسری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ولیم ڈریپر کی مشہور کتاب ''معرکہ مذہب وسائنس کا اردو ترجمہ انہی دنوں میں کیا گیا، مولانا تقریباً ایک سال وہیں رہے اس کے بعد مولانا شبلی کی ایما پر حیدآباد آ گئے اور فوج میں ملازمت اختیار کر لی، کچھ ہی دنوں تک ملازمت کی اس کے بعد دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خان نے حیدآباد میں اپنی صلاحیت اور عقل مندی کی وجہ سے بلند مناصب پر فائز کیے گئے، اسسٹنٹ رجسٹرار پھر عثمان علی خاں کے اتالیق بنائے گئے۔

مولانا حیدآباد کو چھوڑ کر جب ممبئی آئے تو انھوں نے اپنے دوست میر محفوظ علی بدایونی کے اشتراک سے ممبئی میں اورینٹل کمرشیل ایجنسی نام سے ایک تجارتی ادارہ کی بنیاد رکھی تھی، تجارت ادیب و فنکار کے بس کی نہ تھی کمپنی کا بڑا نقصان ہوا، اور بند ہو گئی۔ یہاں ممبئی میں عزیز مرزا کی بحالی دوبارہ ہوتی ہوم سیکریٹری کے عہد پر ہوئی تو مرزا نے مولانا کو بلا کر لیجسلیٹو اسمبلی کو رجسٹر مقرر کر دیا۔ اس زمانے میں مولانا نے لارڈ کرزن کی کتاب GARDEN OF PERSIA کا ترجمہ " خیابان فارس" کے نام سے کیا، والی نظام پنجاب یونیورسٹی نے میر محبوب علی خان کے اس کتاب کی طباعت کے لیے تیس ہزار کے چک سے نوازا، پنجاب یونیورسٹی نے ترجمہ کی خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے پانچ سو روپے انعام دیا، اس کتاب کی تقریظ مرزا دائج نے لکھی۔

مولانا تقریباً بارہ سال تک حیدآباد میں رہے اس قیام کے دوران میں آپ نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا OF MYSTRIES LONDON کا ترجمہ ''فسانہ لندن'' کے نام سے رقم کیے ''معرکہ مسائنس و مذہب'' کے نام سے مولانا نے جو اردو میں ترجمہ کیا یہ کتاب بڑھی مقبول ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا نے ''جنگ روس و جاپان کے نام سے ایک ڈرامہ رقم کیا، ان تراجم کی بدولت علمی و ادبی حلقوں میں مولانا کو بڑی شہرت ملی، ان کی قابلیت سے انگریزوں کو جلن ہو گئی اور ان پر طرح طرح کے الزام عابد کیے گئے اور سازش رچ کر انھیں حیدرآباد سے نکال دیا گیا، اور ان کو دی جانے والی پنشن بھی بند کر دی گئی اس واقعے کو شورش کاشمیری نے اس طرح سے رقم کیا ہے:

''سر مائیکل ایڈوائر حیدآباد میں رینڈیڈنٹ رہ چکے تھے اب پنجاب میں گورنر تھے اور

ان کے اشارے پر خواجہ حسن نظامی نے چغلی کھائی اور حیدآباد سے دوبارہ نکالے گئے

حتی کی پنشن بھی ضبط ہوگئی الزام یہ تھا کہ نظام حیدآباد کو ان اسلامزم کی راہ پر لاتے اور

انگریزوں کے خلاف اکساتے ہیں''۔(۱)

مولانا حیدآباد سے اپنے وطن وزیرآباد لوٹے تو ان کے والد علالت کی حالت میں بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے جہاں ۹ر نومبر ۱۹۱۹ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولوی سراج الدین اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوئے، یہ سرسید احمد خان سے انہیں بہت لگاؤ تھا وہ انہیں بہت پسند کرتے تھے، وہ زمیندار'' سے پہلے ''تہذیب الاخلاق'' میں اپنے مضامین شائع کرواتے رہتے، دوستوں کے کہنے پر ہفتہ وار ''زمیندار'' کی بنیاد ڈالی، ابتداء میں یہ لاہور سے ہی نکلتا رہا لیکن ناموافق حالات اور معاشی مجبوریوں کی بنا پر مجبور ہوکر اسے کرم آباد لے آئے جہاں دستی پریس لگایا اور اپنے اخبار کو چھاپتے، مولوی سراج الدین نے اپنے فرزند سے یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد زمیندار کو ہر حالت میں جاری رکھنا والد کی اس نصیحت پر مولانا ظفر علی خان عمل پیرا ہوئے، والد کی موت کے بعد مولانا نے ''زمیندار'' کو لاہور سے نکالنا شروع کر دیا۔اس دور میں جنگ باقان اپنے عروج پر تھی، ''زمیندار'' کو مولانا نے ہفتہ وار سے روزنامہ کی شکل میں منتقل کر دیا، ''زمیندار'' اخبار میں زمینداروں کے اور کسانوں کے متعلق فلاح و بہبود کے مضامین لکھے جاتے تھے مولانا نے زمیندار میں وطن پرستی کی محبت سے لبریز نظمیں اور اداریے شایع کرنے شروع کر دیے روزنامہ ''زمیندار'' مولانا کی حد و جہد اور صحافتی لیاقتوں کی وجہ سے عوام اور خاص کر زمیندار طبقوں کا مقبول ترین رسالہ بن گیا روزآنہ کی اشاعت اس کی تقریبا تیس ہزار ہوگئی، یہ اخبار انگریزوں کی آنکھوں میں چھبنے لگا کیوں کہ ہند کی آزادی اور انگریزوں کی مخالفت اس اخبار کا خاص نصب العین تھا جس کی وجہ سے کئی مرتبہ زمیندار کی ضمانت ہی ضبط کر لی گئی لیکن عوام نے اخبار کی مطلوبہ ضمانت کو ادا کر دیا اور اخبار اپنے پہلے ہی والی شان وشوکت کے ساتھ جاری رہا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے غیر معینہ مدت کے لیے زمیندار کو بند کر دیا، اور مولانا ظفر علی خاں کو جنگ کے خاتمہ تک کرم آباد میں نظر بند کر دیا، کیوں کہ وہ اچھی طرح واقف تھے کہ ان کی ہمدردی ترکی کے ساتھ ہے اور ترکی جرمنی کا حلیف تھا، لہذا اسی وجہ سے مولانا کو ان کے آبائی گاؤں کرم آباد میں نظر بند کر دیا۔ان دنوں مولانا نے یوں رقم کیا۔

کرم آباد کو سرمائیکل نے بنایا ہے میری علمی حوالات

اگر اس وقت میں آزاد ہوتا دکھا سکتا نہ شاید یہ کرامات

نہ ہوتی ترجمہ کی مجھ کو فرصے کتابوں میں نہ کٹتے میرے دن رات

نہ ہوتا نعت ہی کا سر میں سودا　　نہ دل ہی سے نکل سکتی مناجات
پرو سکتا نہ موتی روز ایسے　　چمک سے جن کی ہیں شمس و قمرمات
گنواتا شاید اپنے وقت کو میں　　دلاتی شرم مجھ کو میری اوقات
عسیٰ ان تکرھو شیئاً کی تاویل　　سمجھاتے یوں ہیں قرآن کی اشارات

دوران نظر بندی مولانا نے کرم آباد میں باغات، پھل دار درخت لگانے اور کاشت کاری کرنے کو اپنے مشاغل میں شامل کرلیا، مولانا ظفر علی خان کو جنگ کو ختم ہونے تک کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا، مولانا نے اپنی علمی پیاس اور نظر بندی میں اکتا دینے والی تنہائیوں کو کم کرنے کے لیے ایک ادبی اخبار ''ستارہ صبح'' جاری کیا اس میں سیاسی مضامین سے الگ ہو کر خالصتا دینی و ادبی مضامین لکھے مگر اس کے باوجود انگریز ظفر علی خاں کی تحریروں سے اس قدر خائف تھی کہ اس غیر سیاسی پرچے کے مضامین سنسر کاٹ کی وجہ سے کئی دفعہ لکھنے پڑتے۔ یہ اخبار بھی چند مہینوں کے بعد بند ہو گیا ۱۹۱۹ء میں مولانا کو نظر بندی سے آزادی ملی تو انھوں نے ''زمیندار'' کو تیسری بار نکالنا شروع کیا۔ ڈاکٹر محمد فاروق خاں ظفر علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا ظفر علی خاں ہمہ جہت شخصیت وصفات کے مالک تھے، وہ خطیب، شاعر، مترجم، صحافی، سیاست داں کی حیثیت سے عوام وخواص میں مقبول ومعروف تھے مولانا کی ذات سیمانی صفات کی حامل ت سیمانی صفات کی حامل تھی، اسی وجہ سے وہ کسی ایک تحریک، جماعت، فرد کا ہو کر نہ رہے۔ کبھی کانگریس کے ہمنوا ہوئے تو کبھی مسلم لیگی بن گئے تو کبھی احراری ہو گئے، مولانا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قومی فلاح وتعمیر اور حصول آزادی کے لیے وقف نظر آتا ہے، عیاری ونفاق کو مولانا نے کبھی حکمت ومصلحت وسیاست سے تعبیر نہیں کیا۔'' (۲)

جنگ آزادی کی تحریک کی ترجمانی وعکاسی نے اور معاصر ملکی حالات نے آپ کی شاعری کو ہنگامی کی عکاسی کا عمل زیادہ ہے، سیاسی معاملات میں تو مولانا کو کمال حاصل ہے، مولانا کو حمد ونعت گوئی میں کافی مہارت حاصل تھی، نعت گوئی میں ان کو تمام کاموں میں فوقیت حاصل تھی۔

مولانا ظفر علی خاں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے، آزادی وطن سے محبت اور برطانوی سامراج سے نفرت ان کی زندگی کا خاص مقصد تھا، مسجد شہید گنج اور تحریک عدم موالات کے سلسلے میں انھوں نے قید وبند کی تکلیفیں برداشت کیں، مجموعی طور پر مولانا نے اپنی عمر کے چودہ سال ملک وقوم کی خاطر قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔ مولانا کی پہلی نظر بندی ۱۹۱۴ء کو کریم آباد میں ہوئی تھی، دوسری گرفتاری دس ستمبر ۱۹۲۰ء میں ہوئی، اور تیسری مرتبہ ۱۹۳۲ء میں گرفتار کیے گئے۔

> ''۱۰ر ستمبر ۱۹۲۰ء میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر مرانسپکٹر پولیس نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ

کے تحت گرفتار کرلیا اور اسٹیشن سے سیدھا سنٹرل جیل لے جائے گئے، پتہ چلا کہ آپ کو حضرو کی ایک تقریر کے جرم میں پکڑا گیا ہے، قصہ کوتاہ مقدمہ چلا، مسٹر مچل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پانچ سال بامشقت قید کا حکم سنایا مولانا کو منٹگمری سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔'' (۳)

مولانا ظفر علی خاں کی کچھ نظمیں اور اداریے کو انگریزوں نے ضبط کرلیا، پھر بھی مولانا حق گوئی کہنے اور لکھنے سے باز نہ آئے۔ ۱۹۲۷ء کا زمیندار کا شمارہ بقرعید کے ذبیحہ پر اداریہ لکھنے کی وجہ سے ضبط کرلیا گیا۔ اس ضبطی سے ناراض ہوکر مولانا نے احتجاجی اور مزاحمتی نظم لکھ ڈالی اس نظم کے ایک ایک لفظ سے احتجاج، بغاوت اور انگریز دشمنی ظاہر ہوتی ہے اس ضبط شدہ نظم کے منتخب اشعار نقل کیے جارہے ہیں:

دل ضبط، زبان ضبط فغال ضبط قلم ضبط
دنیا میں ہوئے یہ ساماں کہیں کم ضبط
برطانیہ کا شیوہ رہا گریہ ہی کچھ روز
سن لو کہ عزیزوں کے ہوئے دیر و حرم ضبط

ڈاکٹر محمد فاروق خاں لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۳۰ء میں زمیندار کے متواتر کئی نمبر ضبط ہوئے اور کئی ضمانتیں بھی ختم ہوگئیں، یہاں تک کہ ''زمیندار'' کا پریس بھی ضبط کرلیا گیا ان زیادتیوں اور مظالم کی تصویر کشی مولانا نے اس نظم میں کی ہے۔

نیچے وہ نظم نقل کی جارہی ہے، پنجاب حکومت نے اس نظم کو بھی ضبط کرلیا تھا۔

دل ضبط، زباں ضبط فغاں ضبط قلم ضبط
سب ساز عیاں ضبط سب سوز مناں
ضبط مظلوم کو فریاد بھی کرنے نہیں دے گا
ڈر ہے کہ نہ ہو جائے یہ سب امن و اماں ضبط
روکیں گے وہ کیوں کر مرے مضمون کی روانی
تنکے سے بھی ہوتا ہے کہیں سیل رواں ضبط
وہ ضبط کریں میری دوات اور قلم کو
ہو جائیں گے خود اپنے تفنگ اور سناں ضبط
تم ضبط زمیندار کے نمبر نہیں کرتے

کرتے ہو حقیقت میں محمد کا نشاں ضبط‘‘(۴)

اردو زبان وادب سے انھیں بے انتہا محبت تھی اردو سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے نظم ونثر، تحریر وتقریر اس کی نوک و پلک سنوارنے میں اپنی پوری زندگی وقف کر دی، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی جملہ یا کوئی فقرہ شین وقاف کی درستگی کے بغیر نہ ہی انھوں نے بولا نہ ہی لکھا۔

بیگم اختر فرماتی ہیں کہ:

’’یہاں تک کہ انھوں نے گھر میں تاکید کر رکھی تھی کہ صرف اردو ہی میں گفتگو کی جائے اور کسی کو اردو کے علاوہ گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی اگر اجازت تھی تو وہ صرف ان کی بیگم کو تھی جن سے پنجابی میں گفتگو کر لیتے اور کسی کو مجال نہ تھی کہ آپس میں پنجابی میں گفتگو کرتے۔‘‘ (۵)

جنگ آزادی کے یہ عظیم مجاہد ایک بلند پایہ ادیب، مدبر، مقرر اور عظیم رہنما نے اپنی پوری زندگی کے چوراسی سال اس دارِفانی میں گزار کر ۲۷ رنومبر ۱۹۵۶ء کو اپنے وطن کرم آباد ضلع گوجرانوالہ میں یہ عارضہ فالج میں مبتلا ہو کر اس دارِفانی سے دار بقا کی طرف ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئے۔ ادب وصحافت کا یہ بے باک سفیر جو زمانے کی گردشوں سے کبھی نہ ہار ماننے والا حالات کا بے خوفی سے مقابلہ کرنے والا ہزاروں من مٹی کے نیچے سو گیا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھا ہے کہ مولانا کی چھ نظموں کو انگریزی سرکار نے ضبط کیا تھا:

(۱) طاقت ایمانی (۲) - فانوس ہند کا شعلہ (۳) - آزادی کا بگل (۴) ہندوستان

(۵)-شراب خانہ

ساز (۶)-تخت یا تختہ۔‘‘ (۶)

مولانا ظفر علی خاں کی زندگی میں نظر بندی اور اسیری کی ایک طویل مدت، ہے بقول مولانا سید سلیمان ندوی:

’’وہ جب بھی قید سے باہر آئے تو اپنے ساتھ ہمارے لیے کوئی نہ کوئی ادبی تحفہ لے کر آئے۔‘‘

وہ جب بھی جیل میں رہے قید کی سعوبتوں اور مشقتوں نے ان کے تخیل فکر میں اضافہ کیا اور خود بھی کندن بن کر نکلے، انھوں نے کبھی آلام زندگی سے منھ نہیں موڑا بلکہ وہ یہی کہتے رہے:

بچپن سے ہی لکھی تھی مقدر میں اسیری
ماں باپ کیا کرتے تھے دل بند جگر بند

نظر بندی اور اسیری کی مدت:

(۱) زمانہ نظر بندی ۴/اکتوبر ۱۹۱۴ء تا دسمبر ۱۹۱۹ء (البتہ خصوصی حالات میں ۱۹۱۷ء میں لاہور آ کر ''ستارہ صبح'' نکالنے کی اجازت مل گئی تھی وہ ۱۹۱۸ء میں حیدر آباد چلے گئے اور وسط ۱۹۱۹ء میں دوبارہ واپس آ گئے اور پھر کرم آباد میں دسمبر ۱۹۱۹ء تک نظر بند رہے، یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔

(۲) وہ از ۲۸/اکتوبر ۱۹۲۰ء تا دسمبر ۱۹۲۴، چار سال ایک ماہ تین دن تک عدم تعاون کے سلسلے میں اسیر فرنگ رہے۔

(۳) ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۱ء تقریباً ایک سال قید رہے۔

(۴) تحریک کشمیر کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء کے آخر میں ایک ماہ کے لیے جیل جانا پڑا۔

(۵) ۱۹۳۶ء میں مسئلہ شہید گنج کے سلسلہ میں تقریباً ڈیڑھ سال نظر بند رہے۔(۷)

مولانا کی تصانیف وتراجم کی تعداد تقریباً ایک درجن ہیں، صحافتی تحریریں اس کے علاوہ ہیں مولانا نے زنداں میں کئی کتابیں تخلیق کیں:

تصانیف:

(۱)	بہارستان	نظموں کا مجموعہ
(۲)	نگارستان	نظموں کا مجموعہ
(۳)	چمنستان	نظموں کا مجموعہ
(۴)	روح معانی	خطبہ خلافت کانفرنس گورکھپور اور چند نظمیں
(۵)	ارمغان قادیان	قادیانی فرقہ کے خلاف نظموں کا مجموعہ
(۶)	معاشرت	مضامین کا مجموعہ
(۷)	جنگ روس جاپان	ڈرامہ
(۸)	خیابان فارس	لارڈ کرزن کی کتاب (Garden of Persia) کا ترجمہ
(۹)	معرکہ مذہب وسائنس	جان ولیم ڈریپر کی مشہور کتاب (B) کا ترجمہ ہے۔
(۱۰)	فسانہ لندن	(Mysteries of London) کا ترجمہ ہے۔

(۱۱) سیر ظلمات یہ بھی انگریزی کا ترجمہ ہے۔

(1)-غلبہ روم:

یہ مولانا کی پہلی زندانی تخلیق ہے، اس کتاب کی تصنیف منٹگمری جیل میں ہوئی اور ۱۹۲۶ء میں لاہور سے طبع ہو کر شائع ہوئی، اس کتاب میں قرآن مجید کی سورہ روم کی ابتدائی آیات کی تفسیر ایران و روم کی جنگ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ یہ آغاز عہد اسلام میں ہرقل قیصر روم اور خسرو پرویز کسری ایران کے مابین ہوئی اول الذکر کو اس میں غلبہ حاصل ہوا تھا۔

(۲)-لطائف الادب:

یہ مولانا کی دوسری زندانی تخلیق ہے اس کتاب میں تاریخی، ادبی، سیاسی اور دینی مسائل پر چند مقالات کا مجموعہ ہے اس کی بھی تخلیق منٹگمری جیل میں ہوئی اس کے مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بخت نصر کا خواب (۲) تغلق تیمور خاں کا اسلام
(۳) تحریک اتحاد تورانی (۴) روئی کا درخت
(۵) العقبۃ (۶) صلاح الدین ایوبی اعظم کا ذکر بزم فرنگ میں
(۷) مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار (۸) ایک تاریخی معجزہ
(۹) تصریحات مونسرات

اس کتاب کا مقدمہ مولانا عبدالمجید سالک صاحب نے لکھا ہے:

> ''یہ چند مضامین کا مجموعہ جو حضرت مولانا ظفر علی خاں کے زمانہ اسیری کی خاموش محنت کا ثمر شیریں ہیں اور جس کا دیباچہ نگاری کا فخر مجھ عاصی کے قلم سیہ مجرم کو عطا کیا گیا ہے۔(۸)

(۳)حبسیات

حبسیات یہ مولانا ظفر علی خاں کی تیسری زندانی تخلیق ہے جب مولانا منٹگمری جیل میں پانچ سال کے لیے قید کر لیے گئے تھے، اس زمانے میں آپ نے اس کتاب کی تخلیق کی۔ اس مجموعے کلام میں ستانوے نظمیں شامل ہیں۔ ضخامت کے اعتبار سے

۱۰۸ر صفحات ہیں۔ مولانا کا شعری نصب العین ہندوستان کی آزادی اور اسلام کی سربلندی تھی، مولانا کے کلام میں خطابت، جوش، آہنگ اور گھن گرج کی آمیزش پائی جاتی ہے جس نے مولانا کے کلام کو منفرد وممتاز بنا دیا، مولانا کے کچھ زندانی اشعار درج ذیل نقل کیے جا رہے ہیں:

جتنی بوندیں تھیں شہید ان وطن کے خون کی
قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
مرحبا اے تو گرفتاران بیداد فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں
قسم ہے جذبہ حب الوطن کے بے پناہی کی
ہمارا ملک غیروں کا غلام اب رہ نہیں سکتا

(فانوس ہند کا شعلہ)

درس عبرت یہ سنٹرل جیل لاہور ۱۹۳۱ء میں لکھی گئی:

ایک نیا درس دیا گردش دوراں نے مجھے
دی ہے دعوت اگر اس مرتبہ زنداں نے مجھے
کوئی کافر مری تذلیل نہ کر سکتا تھا
مرحمت کی ہے یہ سوغات مسلماں نے مجھے

(درس عبرت)

تخت یا تختہ

سر بکف میدان میں آ پہنچے جوانان وطن
جن کی قربانی پہ ہے دار و مدار انقلاب
گھر سے نکلے ہیں مسلمان بھی کفن باندھے ہوئے
نعرہ تکبیر ہے مضراب تار انقلاب
خاک میں مل جائے گا سرمایہ داری کا غرور
گر یہی ہے گردش لیل و نہار انقلاب

وقت آ پہنچا ہے کہ مرجاؤ یا آزاد ہو
تخت یا تختہ ہے حکم تاجدار انقلاب
پیتے ہیں جیل میں چکی اسیرانِ فرنگ
آسیائے گردش دوراں ہے زنداں فرنگ
پاؤں میں بیڑی، گلے میں تختہ اور ہاتھوں میں داغ
امت مرحوم پر کیا کیا ہیں احسان فرنگ
آج جن کی یہ خطا ہے کہ ذرا کالے ہیں
پی رہے ان کا لہو جیل کے رکھوالے ہیں
کبھی کو لہو کی مشقت کبھی چکی کا عذاب
جس سے ہاتھوں میں مجاہدوں کے پڑے چھالے ہیں
قید گورے بھی ہیں چوری میں مگر ان کے لیے
جیل سرکار نے گلزار بنا ڈالے ہیں
زنداں کی عافیت کبھی جس سے ہوئی تھی تنگ
زنداں میں اب وہ شور سلاسل نہیں رہا

☆☆☆

حوالہ جات:

(1) ظفر علی خان: (مضمون) شورش کاشمیری، نقوش (شخصیات نمبر اول) لاہور، ص: ۵۹۸
(۲) اردو کا زندانی ادب، ڈاکٹر محمد فاروق خان، ص: ۴۲، ۲۰۱۷، ناشر عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی
(۳) ظفر علی خان، شورش کاشمیری، ص: ۵۳
(۴) اردو کا زندانی ادب، ڈاکٹر محمد فاروق خال، ص: ۴۴، ۲۰۱۷، دہلی
(۵) انٹرویو از بیگم اختر علی خان، ۱۹۶۸ء، بمقام لاہور
(۶) اردو کا حبسیاتی ادب، ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، ص: ۱۵۰

(۷) مولانا ظفر علی خان، احوال وآثار-ص: ۲۶۴

(۸) بحوالہ ظفر علی خان، شورش کاشمیری، ص: ۱۱۷

Aaisha

Department of Urdu

Veer Bahadur Singh Purvanchal University

Jaunpur (U.P)

ماجدہ بانو
ریسرچ اسکالر
ڈی۔سی۔ایس۔کے ۔پی۔جی کالج،مئو
موبائل نمبر:79057118732,9838869751

فن سوانح نگاری ایک مطالعہ

Abstract:

Biography (Sawanih Nigari) holds a distinguished place in Urdu prose, combining historical accuracy, literary elegance, and psychological insight. Scholars such as Dr. Abdul Salam Sandelvi have emphasized its multidimensional nature, identifying three essential components: the individual, the record of life experiences, and the literary mode of expression. This study explores the evolution of biographical writing in Urdu, tracing its foundations in historical narrative, its enrichment through literary aesthetics, and its refinement under scientific and psychological perspectives. By analyzing critical views of thinkers like Herbert Spencer, Bacon, and André Maurois, the paper highlights the challenges of selection and omission in presenting a life story. It argues that effective biography requires a balance between factual precision and artistic narration, ensuring that the subject's personality emerges as a living portrait rather than a mere chronicle of events. The research underscores that the art of biography in Urdu not only documents individual lives but also reflects broader cultural, intellectual, and literary currents. Thus, Sawanih Nigari becomes both a mirror of personal experience and a vital genre contributing to the richness of Urdu literature.

Keywords: Urdu prose, biography, Sawanih Nigari, literary aesthetics, historical

narrative, psychological perspective, selection and omission

Author: Majida Bano, Research Scholar , D.C.S.K P.G. College, Mau

اردو نثر میں جن اصناف کو مقبولیت حاصل ہے ان میں سوانح نگاری کو ایک اعلی مقام حاصل ہے۔سوانح نگاری پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی نے اسے تین اجزاء میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) فرد یا شخص

(۲) اس فرد یا شخص کی زندگی کے تمام اعمال وافکار تجربات ومشاہدات

(۳) ادبی پیرایۂ بیان کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔مگر وہ اس فن کا مطالعہ سائنسی نقطۂ نظر سے بھی کرنا چاہتے ہیں۔

اصول سوانح نگاری اور حالی کے عنوان کے تحت ایک مضمون میں انہوں نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

> ''سوانح حیات کو ہم چار نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔اول تو سوانح حیات کی ایک تاریخی حیثیت ہوتی ہے اس لحاظ سے سوانح حیات میں سچے واقعات کا ذکر ہونا چاہئے۔دوسرے سوانح حیات کو انفرادی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اس لحاظ سے ہیرو کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز ہونا چاہئے اور جملہ محاسن کا مجموعہ ہونا چاہئے تا کہ دوسروں کے سامنے وہ مثال بن سکے۔اس کے علاوہ سوانح حیات کو ہم ادبی نقطۂ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں،اس صورت میں سوانح حیات میں وہ تمام خوبیاں ہونا چاہئیں جن سے کسی زبان کا ادب ایک اعلی اور بلند مقام حاصل کرتا ہے۔آخر میں سوانح نگاری کو ہم سائنسی نقطۂ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف کے بیان میں سائنسی حیثیت اور قطعیت ہونا چاہئے۔''(1)

فرد یا شخص

مندرجہ بالا تعریفوں سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ سوانح نگاری کے لئے سب سے پہلے کسی فرد یا شخص کی ضرورت ہے۔جس کی زندگی کے اعمال وافکار تجربات ومشاہدات کے ذریعے اس کی شخصیت روشن کی جاتی ہے۔اور اس کی زندگی کے تمام پہلو اجاگر کئے جاتے ہیں۔اس طرح سوانح نگاری میں شخص یا فرد بنیادی اہمیت کا مالک ہے

جس مصور فطرت کائنات نے بکھرے رنگا رنگ جلوؤں میں سے کسی ایک فرد کا انتخاب کرتا ہے۔اسی طرح ایک سوانح نگار کو بھی اس جان فانی میں بسنے والے کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک فرد کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو مناسب اور مفید موضوع ثابت ہو۔

تاریخ

فرد یا شخص کی مکمل شخصیت کے اظہار کا نام تاریخ ہے۔اس کی پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام واقعات و حادثات تمام بیرونی واندرونی محرکات جن میں نفسیاتی محرکات بھی شامل ہیں اور جن کے عمل اور ردعمل سے فرد یا شخص کی شخصیت بنتی یا بگڑتی ہے۔اس سے مراد نفسیاتی الجھنوں پر مبنی انسانی اعمال وافکار کے تمام تضاد وتصادم ہیں۔جن کے تانے بانے سے کسی کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔سوانح نگاری کے اس جزء یعنی تاریخ میں صاحب سوانح کے ان تمام احوال وآثار کا محاسبہ کیا جاتا ہے ۔انسانی زندگی کے ان تمام حرکات وسکنات مشاہدات اور مجربات کو معرض بحث میں لایا جاتا ہے جن کے ذریعے اس کی مکمل اور فکری شخصیت سامنے آتی ہے۔اچھی سوانح عمریوں کے راز بقول بیکن'' ان کے عام اور نجی دونوں طرح کے اعمال کی پیش کش میں مضمر ہے۔

ہربرٹ اسپینسر کا خیال ہے کہ صاحب سیرت کے تمام اعمال وافکار کو پیش کرنا چاہئے کیونکہ یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے وہ بالکل فطری انداز میں نظر آسکتا ہے۔ورنہ اس کی شخصیت کی پرت ادھڑنے کے بدلے دوسری کئی پرتیں چڑھ جانے کا خوف ہے اور حقیقی شخصیت کے گم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔کیوں صاحب سیرت کی زندگی سے متعلق دستیاب مواد میں ترک وانتخاب سے کام لینے پر سوانح نگار کے اپنے نظریات،تاثرات اور تعصّبات کے شریک ہونے کا گمان ہے۔

> اگر اختصار کے خاطر کسی کی زندگی کے تمام واقعات سے پہلوتہی کی جائے اور صرف خصوصی خدو خال کو سوانح عمری میں شامل کیا جائے تو متعلقہ زندگی کی صحیح تصویر کے بجائے مبالغہ آمیز تصویر ابھرے گی۔ (2)

اندرے مورے نے لکھا ہے:

> سوانح نگاری میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ جوں کا توں پیش کردیں۔اس طرح ہر شخص کی سوانح عمری اس کے ایام حیات کی طرح طویل ہوجائے گی۔(3)

س طرح صاحب سیرت کے زندگی کے تمام احوال وآثار میں ان واقعات کا انتخاب کرنا چاہئے جو اس کی شخصیت کے کسی پہلو کو نمایاں کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔سوانح نگاری دراصل چھوٹے اور بڑے واقعات کی آمیزش سے ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کا نام ہے اس لئے صاحب سوانح کی زندگی میں ترک وانتخاب کرنے میں بڑی فن کاری کی ضرورت ہے۔

ادب

سوانح نگاری کے دو اجزاء فرد اور تاریخ پر اب تک گفتگو رہی ہے۔اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے سوانح نگاری کا فن انسان کے اعمال وافکار کے ارتقاء کی کہانی ہے۔ لیکن انسان کے اعمال وافکار کے ارتقاء کی یہ کہانی ادھوری ہوگی۔اگر اسے مناسب پیرایہ بیان نصیب نہ ہو۔

سوانح نگاری بطور شبلی ''واقعات کی کھتونی'' ہوگی اگر اظہار و بیان کی خوبیوں سے عاری ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ سوانحی موضوع کے انتخاب میں چابک دستی اور تاریخ وواقعات کے ترک وانتخاب میں ہوشیاری سے اس فن کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اسے اظہار و بیان کے لئے مناسب پیرایہ کی ضرورت ہے۔ورنہ اچھی سے اچھی دلچسپ دلکش اور سبق آموز زندگیوں کی کہانی بھی غیر دلچسپ اور بوجھل ہوجائے گی۔اس کے برعکس مناسب پیرایہ بیان مل جانے پر ادنی سے ادنی زندگیوں کی کہانیوں میں بھی وہ تمام دلکشی، شگفتگی اور رعنائی سمٹ جائے گی جو اچھی سوانح عمریوں کا خاصہ ہے۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ فن سوانح نگاری میں ادبی جزء کو جو دخل ہے وہ دوسرے اجزاء کو نہیں اسی لئے فن سوانح نگاری میں ادب کی تلاش کرتے ہوئے سید احتشام حسین نے لکھا ہے:

اچھی سوانح عمری کے لئے ادبیت تو لازمی جزء ہے۔(4)

ایک سوانح نگار کی سوانح نگاری میں ادب شامل ہے یا نہیں؟ اس کا پتا کس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اندرے مورے نے یوں بیان کیا ہے۔

> سوانح نگار کسی شبیہ اتارنے والے یا مصور کی طرح اپنے موضوع میں جس کا بیان وہ کر رہا ہے ضروری اوصاف کا انتخاب کرے۔اس انتخاب کے ذریعہ اگر وہ موضوع کے وجود کو خراب کیے بغیر انتخاب کر لیتا ہے تو وہ آرٹسٹ کا کام انجام دیتا ہے۔(5)

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی سوانح نگار زندگی میں اکٹھا بے شمار مواد سے شخصیت کو ابھارنے کے لیے نمایاں اور ضروری پہلوؤں کا انتخاب کر لیتا ہے تو وہ سوانح نگاری کو ادبی کارنامہ بنا دیتا ہے۔

سائنس

مذکورہ نتائج اخذ کرنے کے ساتھ ہی یہ سوال ذہن میں گونجنے لگتا ہی کہ جب سوانح حیات ادبی کارنامہ ہے تو اس فن میں سائنس کی قطعیت و جامعیت کی تلاش جیسا کہ کچھ ناقدین کرتے ہیں کہاں تک درست ہے۔سوانح نگاری میں سائنسی عنصر کی تلاش شخصیت کی پرت اور واقعات وواردات یعنی تاریخ کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ناقدین اس فن میں سائنسی عنصر کی تلاش اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے حقیقی انسان اور اس کے واقعی خدوخال ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔ان ناقدین کا خیال ہے کہ

سوانح کے موضوع کو فطری شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ اور واقعات و واردات مہیا کرنے میں ہر ممکن ذرائع استعمال کرنے چاہئے۔ اوران کے تجزیہ وتنقید میں اسی قطعیت سے کام لینا چاہئے۔

حواشی:

(1) اصول سوانح نگاری اور حالی مقالہ از ڈاکٹر عبدالسلام ندوی، ص42،43

(2) اردو میں سوانح نگاری، سید شاہ علی، ص48،49

(3) اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ڈاکٹر آنسہ الطاف فاطمہ، ص45

(4) تنقیدی جائزے مضمون سوانح نگاری، سید احتشام حسین، ص274

(5) آسیکٹس آف بایوگرافی، اندرے مورے، ص44

Majida Bano

Research Scholar

D.C.S.K P.G. College, Mau

Mob No: 9838869751,79057118732